Fikr-o-Nasar (Islamabad) 46:4 (2009)

فکر و نظر............ اسلام آباد　　　　جلد: ۴۶　　شمارہ: ۴

مسلمان اور مغرب
(تاریخ کی نظر میں)

تحریر: اسماعیل ابراہیم نوّاب☆، مترجم: عمرفاروق☆☆

[یہ مضمون 'ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد' اور جارج ٹاؤن یونیورسٹی، واشنگٹن ڈی سی، کے ذیلی شعبہ Centre for Muslim-Christian Understanding کے تعاون سے منعقد ہونے والے سیمینار کے منتخب مقالات پر مشتمل کتاب (شائع شدہ 2001ء)، : *Muslims and the West: Encounter and Dialogue* سے اسماعیل ابراہیم نوّاب کے مقالے بعنوان: "Muslims and the West in the History" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس سلسلے میں واضح رہے کہ:

۱۔ ترجمہ کو حتی الامکان اصل کے مطابق رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ چند مقامات پر مصنف کے ادبی پیرایۂ بیان کی رعایت سے ترجے کے اسلوب میں ذرا سا آزاد رنگ اختیار کرنا مناسب معلوم ہوا۔

۲۔ بعض مقامات پر کسی وضاحت کی ضرورت محسوس ہونے پر مترجم کی طرف سے کچھ حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مترجم]

Abstract

This article deals with Muslims-West relations in their historical perspective along with taking a close look at the recent developments in this connection, analyzing the prospects and the challenges in the offing. The article also discusses the issues and problems impeding the growth of better Muslims-West relations. It makes a strong case that Muslims and the Christians must join hands to serve God and man in a world in which secularism, materialism, social and political injustice,

☆ اسماعیل ابراہیم نواب مکہ مکرمہ سے تعلق رکھنے والے سعودی اسکالر ہیں، جو اسکاٹ لینڈ کی ایڈن برگ یونیورسٹی، اور ملیشیا یونیورسٹی، کوالالمپور میں پڑھاتے رہے۔ وہ Aramco کمپنی کے جنرل منیجر بھی رہے ہیں۔
☆☆ ریسرچ ایسوسی ایٹ، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad.　　http://iri.iiu.edu.pk/

physical and moral maladies, armed conflicts are the norm of life. These challenges provide abundant areas of cooperation between West and the Muslims, like interaction between Muslim and Christian scholars in an academic environment, working towards alleviation of suffering through medical research and pharmaceutical technologies and creating economic justice and stability by intoducing socially responsibel modes of financing practiced in Islamic banking.

☆☆☆☆☆

پاکستان اقبال کی سرزمین ہے، جس کے اسلامی زاویۂ نظر اور شاعری نے جدید دنیا کے دو بتوں کا نہایت قوت سے مقابلہ کیا۔ یہ دو بت 'قومیت پرستی' اور 'سیکولر مادیت' ہیں۔(۱) اقبال کے ہاں پائی جانے والی 'آتشِ شعر' [رابندر ناتھ ٹیگور(۲) کی 'راگ کی آگ' کے مقابل و متوازی] ایک ایسا عطیہ تھی جس نے مسلمانوں اور عیسائیوں، ہر دو کے دل و دماغ کو [فکر و عمل کی] گرمی بخشی۔ اس نے سرزمینِ پیغمبرِ اسلامؐ اور شرقِ مسلم کے ساتھ ساتھ Goethe کے وطن اور غربِ نصرانی کے لیے بھی 'تپش آمادگی' کا سامان مہیا کیا۔(۳)

اس لحاظ سے 'اسلام اور مغرب' کے موضوع پر منعقد ہونے والا یہ سیمینار پاکستان ہی میں برپا ہونا چاہیے تھا؛ پاکستان، جسے معرضِ وجود میں لانے کی خاطر لاکھوں انسانوں نے تگ و دو کی اور قربانیاں دیں۔ ان کی یہ ساری تڑپ اور جِدّ و جُہد ایک 'نمونہ جاتی' فلاحی مسلم ریاست قائم کرنے کے لیے تھی، جہاں 'خدا کی وحدانیت' کا دینی تصور اور 'عدل و انصاف کے قیام' کا سماجی نظریہ بروئے کار لایا جا سکے۔(۴) موجودہ دور میں پاکستان وہ واحد ملک ہے جسے مسلمانوں نے نسلی، لسانی یا قومیتی بنیادوں پر قائم نہیں کیا، بلکہ یہ نظریاتی اساس پر گویا 'لاوجود' سے (ex nihilo) تخلیق کیا گیا، اور سماجی و معاشی انصاف کی خاطر اسلام سے گہرے تعلق اور بے پایاں عقیدت کی مظہر ایک بہت بڑی عوامی تحریک کے نتیجے میں منصّۂ شہود پر آیا۔ یہ اقبال کی نابغۂ روزگار شخصیت تھی جس نے (مغرب کے سرچشموں سے گہرے طور پر، لیکن تنقیدی بصیرت کے ساتھ فیض یاب ہونے کے بعد) پہلے پہل اس قسم کی ریاست کا تصور دیا، اور مغرب کے مادی زاویۂ نگاہ کی حامل 'سیکولر' ریاست کے تصور کو للکارا۔(۵) اس طرح پر پاکستان کی تخلیق سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں جوش و جذبے کی لہر دوڑ گئی، اور William Wordsworth کے بقول:

Bliss was it in that dawn to be alive,

But to be young was very heaven.(۶)

(اس صبحِ [صادق] میں [سانس لینا اور] جینا، [کس قدر] سرخوشی کا حامل تھا۔ البتہ [عنفوانِ] شباب میں ہونا، [تب] نہایت فردوس بخش [اور نعمت و سعد بختی کا پہلو لیے ہوئے] تھا۔)

دنیا بھر کے مسلمانوں کی نیک خواہشات ہمیشہ اپنے پاکستانی بھائیوں کے ساتھ رہی ہیں، اور وہ ان کی اس باہمت اور دلیرانہ مہم کو کامیابی سے سر کرنے کے لیے دعا گو رہے ہیں۔ وہ اس بات کی تمنا رکھتے ہیں کہ پاکستان کے مسلمان اپنے شاندار ماضی کی روایات ساتھ لیے اس انداز کی زندگی گزاریں جو کامرانیوں کے بلند تر درجات حاصل کرنے میں محرک و معاون ثابت ہو۔ پاکستانی قوم کا یہ بے مثال تجربہ دنیا کی دیگر مسلم اور غیرمسلم اقوام کے لیے خفتہ صلاحیت کے حامل بنیادی اثر کی حیثیت رکھتا ہے۔(۷)

۱۔ مسلم مغربی تعلقات

''مسلمان اور مغرب: تاریخ کی نظر میں'' ایک ایسا موضوع ہے جو دنیا کی نصف آبادی کے باہمی تعلقات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ براہِ راست مناسبت اور فوری اہمیت کا حامل موضوع قرار پاتا ہے، کہ مسلمانوں اور مغرب کے تعلقات جو نہج اختیار کریں گے، ماضی کی طرح آئندہ بھی وہ دنیا کے لیے نہایت اہم نتائج کے حامل ہوں گے۔

جغرافیائی لحاظ سے عیسائی اور مسلم تہذیبیں ایک دوسرے کے پڑوس میں واقع ہیں، اور مذہبی سرحدوں، پرامن ثقافتی تبادلے، اقتصادی آمد و رفت اور کبھی کبھار کے باہمی تعاون سے ورے ان کے مابین زود وقوع تناؤ، شدید دشمنی، مسلح آویزش اور [متقابل] فوجی اتحاد کی ایک لمبی دھاری دار تاریخ کا وجود پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے کوئی ہمیں باور کرا سکتا ہے کہ ان دو تہذیبوں کا 'استقبال ان کے ماضی کی تصویرِ ہو گا۔ تو کیا واقعی ہم مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان، بغیر کوئی بہتری کی امید باندھے، عدم مفاہمت کا ایک اور 'ہزاریۂ' (millennium) گزارنے پر مجبور ہیں؟ یا پھر وقت ان دو تہذیبوں کے ورثاء کو مہلت دے گا کہ وہ امن و تعاون کے 'ستارے بوئیں' اور انھیں یوں سینچ کر بار آور کریں کہ یہ 'گلستانِ جہان، طائرانِ انسانیت کی نغمہ سنجی' سے چہچہا اٹھے، اور 'پژمردہ کلیوں کے چہرے کھِل کر وہ مہک' دینے لگیں جسے لے کر 'موجِ صبا، گُل کو گُل سے رشتۂ ہم آہنگی' میں باندھ

دے؟!

[پھلا پھولا رہے یارب! چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں](۸)

مسلمانوں کی بھلائی کی خاطر ہم آہنگی اور تعاون کی فضا میں مستقبل کے تعلقات کے بارے میں سوچ بچار اور منصوبہ بندی کرنے کو مغرب اور باقی دنیا ہمارے لیے انتہائی ناگزیر ہیں۔ باہمی تعاون کا یہ تعلق یقیناً کسی مضبوط بنیاد پر استوار ہونا چاہیے۔ اس غرض کے لیے ماضی پر ایک نظر ڈالنا، اور اپنی محدود کامیابی اور بتکرار وقوع پذیر ہونے والی غلطیوں سے سبق حاصل کرنا از بس ضروری ہے۔ اس مقالے کا بنیادی مقصد غور و فکر کے لیے مواد کی فراہمی، نیز تعاون کی نئی راہوں کی تلاش ہے، ایسا تعاون و ہمکاری جو بائیبل کے الفاظ میں 'اپنے ثمرات سے پہچانا جائے۔'(۹) جبکہ قرآن نے مسلمانوں کو امید باندھے رکھنے، اور 'رحمتِ خداوندی سے مایوس نہ ہونے' کی ہدایت کی ہے۔(۱۰)

یہ موضوع اس قدر پہلودار، وسیع اور تاریخی، نیز جذباتی اعتبار سے تنوع اور ہماہمی کا حامل ہے کہ [اسے حذف و اختصار اور حک و برید کے ساتھ کسی قدر] سطحیت کا خطرہ مول لیے بغیر ایک مضمون میں بند کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا مجھے صرف ان امور تک محدود رہنا ہو گا جو میرے خیال میں مسلمانوں اور مغرب کے مابین آئندہ کے تعلقات پر بنیادی اثرات کے حامل ہیں۔ موضوعِ بحث یہ امور، بظاہر مختلف اور بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن انھیں ماضی و حال سے ملانے اور باہم ربط دینے والا عنصر ایک ہے؛ اور وہ ہے مسلمانوں کے خلاف تکرار کے ساتھ وقوع پذیر ہونے والی عداوتی کارروائیاں۔

ان عداوتی کارروائیوں سے پرے، مغرب کے بعض تعلیمی، مذہبی اور دوسرے عام حلقوں میں ایسی محدود نوعیت کی پیش رفت ضرور ہوتی رہی جس میں اسلام کو معروضی انداز میں پیش کرنے اور مغرب اور مسلمانوں کے مابین بہتر تعلقات قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ ان حلقوں کی رائے میں یہ تعلقات، تصادم کی بجائے باہمی تعاون کی بنیاد پر استوار ہونے چاہئیں، جو ایک ممکن الوقوع بات ہے۔(۱۱) مسلم مسیحی کے تعلقات کے بارے میں رویے کی یہ تبدیلی ہنوز ابتدائی مرحلے میں ہے، اور اسے مغرب کے رگ و ریشہ میں پیوست مسلم دشمن روایت کے 'بھاری پتھر' کا سامنا ہے۔ لیکن تازہ فکر کی یہ چھوٹی سی لہر اس بات کی صلاحیت رکھتی ہے کہ ایک بڑی موج میں بدل کر ہر دو اقوام کے درمیان ماضی کی تلخیوں اور کینہ و عداوت کی چٹان کو کسی قدر سرکا سکے۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو اپنے

مثبت نتائج کے اعتبار سے نہ صرف مغرب اور مسلمانوں، بلکہ پوری دنیا کے لیے یہ بات ایک تاریخی موڑ ثابت ہو گی۔

اگر ہم بہتر فہم و افہام کے خواہش مند ہیں تو ہمیں کینہ پروری سے ہٹ کر ان مشکل مسائل کو زیرِ بحث لانے سے گریز نہیں کرنا چاہیے جو مسلمانوں کے مغرب سے تعلقات کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا بناتے آئے ہیں۔ ہمیں لازماً مغرب کی مسلمانوں، ان کے پیغمبرؐ، دین اور تمدن و ثقافت کے بارے میں صدیوں پرانی غلط فہمی اور قدح و طعن مسئلے سے آغاز کرنا ہو گا۔ اسلام اور مسلمانوں کو غلط اور فرسودہ انداز میں پیش کرنے والی مغرب کی اس روایت کے کھنگالنے سے ابتدا کرنا ہو گی جو کم کم لاعلمی کا شاخسانہ، مگر بیشتر قصداً اور سوچے سمجھے انداز میں مغرب کے بغض و عناد کا مظاہرہ ہے۔

اس تاریخی اور تاحال برقرار عداوت پر مبنی کارروائی کے اسباب گنجلک بھی ہیں اور ان میں تبدیلی بھی آتی رہتی ہے۔ یہ [معاندانہ، عداوتی طرزِ فکر و عمل] اس وقت بھی پایا جاتا تھا جب مغرب میں عیسائیت کا دوردورہ تھا، اور یہ [رویہ] اب بھی اسی طرح برقرار ہے جب مغرب میں سیکولرازم کا چرچا ہے۔(۱۲) یورپ کے 'قرونِ وسطیٰ' میں تعصب کے شعلوں کو بھڑکانے کے لیے، اسلام کے طاقت ور پیغام کے تیزی کے ساتھ پھیلنے سے خائف عیسائی پادریوں کا حصہ، نسلی تعصب پر مبنی یورپی اور امریکی تعلیمی تحقیقی حلقوں کی ان معاصر 'حربی کارروائیوں' کے مقابلے میں بہت کم ہے جو اشتمالی (Communist) دشمن کے سقوط کے بعد اس کی جگہ ایک نیا خیالی دشمن اختراع اور پیش کرنے کی انتہائی کوشش میں مصروف ہیں۔(۱۳) یہ چند تعلیمی تحقیقی حلقے مغرب میں پالیسی سازوں کے ساتھ گہرے روابط رکھتے ہیں، اور یہ پالیسی ساز لوگ پچھلے پچاس [اب ساٹھ] برس کے جمے جمائے یک قطبی عالمی نظام کی گرفت برقرار رکھنے کی خاطر 'بھیڑیے کے مانند بہانوں کی تلاش' میں رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان تعلیمی تحقیقات کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن رائے عامہ کے وسیع تر میدانِ مسابقت میں معلومات کی متعصّبانہ ترسیل اور غلط فہمیاں پروان چڑھانے، نیز دنیا کی نظروں میں اسلام اور مسلمانوں کی تصویر خراب کرنے کا دھندا، آج مغربی ذرائع ابلاغ کے ہاتھوں اس پیمانے پر کیا جا رہا جس کی ماضی میں مثال نہیں ملتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغربی ذرائع ابلاغ اور وہ نام نہاد ماہرینِ مذہب جن سے اسلام کے بارے میں رائے لی جاتی ہے، chansons de geste(۱۴) کے ان داستان سرا شعراء کا مسلم دشمن کردار بطور ورثہ اپنے ساتھ لیے پروان چڑھے ہیں جنھوں نے ابتدائی ادوار کے مسلمانوں کی نامعقول، مضحکہ خیز اور متحجر تصویر پیش کرنے اور اسے مقبولِ عوام بنانے میں مرکزی کردار ادا کیا۔(۱۵)

۲۔ مسلم مغربی تعلقات کا تاریخی پسِ منظر

جب ہم مسلمانوں کے مغرب سے تعلقات کے آغاز کی بات کرتے ہیں، تو ہماری مراد مسلمانوں اور مسیحی یورپ کے تعلقات سے ہوتی ہے: وہ مسیحی یورپ جو ایک وقت میں مغرب کہلاتا تھا، اور بعد میں پوری مغربی دنیا نے جس سے اپنا مذہب، ثقافت اور دوسری اقوام کے بارے میں زاویۂ نگاہ حاصل کیا۔ ہم مسلم مسیحی تصادم میں مذہب کے غالب عنصر کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتے، بدیں وجہ کہ مغرب کے سیکولرازم اختیار کرنے سے پہلے یہ ان اہم ترین اثرات میں سے ایک ہے جن کے تحت مسلمان اور مسیحی، ہر دو معاشروں کا طرزِ حیات تشکیل پایا۔ لیکن مذہب اپنی قبولِ عام حاصل کرنے والی صلاحیت، نیز پادریوں اور حکمرانوں کے درمیان پائے جانے والے مضبوط اتحاد کے باعث عام طور پر ان معاشی، سیاسی یا فرقہ جاتی مقاصد پورے کرنے کے لیے ذریعۂ کار کے طور پر استعمال کیا گیا، جو درحقیقت مذہب کی تعلیمات سے متصادم تھے۔(۱۶)

ابتدائی دور کے مسلمانوں نے جب ساتویں صدی عیسوی میں شام فتح کیا، تو وہاں کی مظلوم عیسائی آبادی نے [نجات دہندہ سمجھ کر] ان کا استقبال کیا، کہ اب وہ ان نئے حکمرانوں سے اپنی مذہبی آزادی کے تحفظ کی خواہش کر سکتے تھے۔ یہ اس زمانے کا ایک منفرد واقعہ ہے جب مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک طرف، خود مسیحی فرقوں کے درمیان مذہبی عدم رواداری گہری جڑیں پکڑے ہوئے تھی۔ جبکہ مسلمانوں میں رواداری کی یہ روایت اسلامی تعلیمات کی ٹھوس بنیادوں پر استوار ہے، جن میں عیسائیوں اور یہودیوں کو ممیّز مذہبی گروہوں کے طور پر، اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی کے حق کے ساتھ تسلیم کیا گیا۔ قرآن میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ دین میں کوئی 'جبر و اِکراہ' نہیں۔(۱۷) تاریخ میں درحقیقت پہلی بار پیغمبر اسلامؐ کی مدینہ میں قائم کردہ ریاست نے مذہبی رواداری (جسے آج کی اصطلاح میں 'religious pluralism' کہہ سکتے ہیں) کو اپنایا اور اسے تحریری طور پر قانونی شکل دی۔ نتیجتاً، مذہبی رواداری کو مسلمانوں کی نمایاں ترین خصوصیات میں شمار کیا گیا، (گو وقتی طور پر مسلم معاشرے کے بعض حصوں میں رواداری سے متعلق مذہبی احکام پر عمل درآمد نہیں ہوا)۔(۱۸) اسی رواداری کے سبب مذہبی اقلیتیں ان ملکوں میں نمایاں تعداد میں پائی جاتی ہیں جہاں صدیوں سے مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ہندوستان میں، جہاں مسلمانوں کی سیاسی و عسکری طاقت کے مغلوب ہو جانے کے بعد بھی لاکھوں انسانوں نے اسلام قبول کیا، وہاں اُن کی حکومت کے لمبے عرصے کے دوران آبادی کا غالب حصہ ہندوؤں پر مشتمل رہا۔(۱۹)

جب اسلام کی لہر عیسائی غلبے والے علاقوں میں داخل ہوئی تو وہاں کے بہت سے لوگ اسلامی تعلیمات سے متأثر ہو کر مسلمان ہوئے، اور یوں اس میں [ایک بڑی موج کا] پھیلاؤ آ گیا۔ اسلام کی طاقت اور کامیابی کی یہ صورتِ حال عیسائی پادریوں کے لیے بہت سے ایسے پریشان کن سوال اٹھانے کا باعث بنی جن سے ان کا پہلے کبھی سامنا نہیں ہوا۔ ان میں سب سے اہم سوال [اسلام کی] تعریف [اور اصطلاحی 'حد'] متعین کرنے کا تھا۔ چرچ اپنے پیروکار اس نئے مذہب کی آغوش میں جاتے دیکھ رہا تھا، جو عیسائیت کے بعد دنیا کا واحد آسمانی مذہب تھا۔ مگر یہ نیا آسمانی مذہب تھا کس نوعیت کا؟ عیسائی خود سے دریافت کرنے لگے کہ آیا یہ ان کے گناہوں کی سزا ہے جو خدا کی طرف سے مقرر کی گئی؟ اسلام قطعی طور پر بت پرستی کا مذہب نہیں تھا کہ جسے بیک نظر رد کر دیا جاتا۔ یہ خدائے واحد پر ایمان رکھنے پر زور دیتا تھا۔ مگر خدا کے انسانی شکل میں ظہور(۲۰)، تثلیث، تصلیب اور انسانیت کے لیے کفّارے(۲۱) ایسے عیسائیت کے بنیادی عقائد کو رد کرتا تھا۔ تاہم، بہت سی تعلیمات میں اسلام، عیسائیت کے ساتھ اشتراک بھی رکھتا تھا۔ یہ بائبل میں مذکور تمام پیغمبروں کو تسلیم کرتا تھا؛ اخلاقی ذمہ داری پر زور دیتا تھا؛ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے کی بات کرتا تھا۔ عیسائیوں نے، جو صرف اپنی مذہبی تاریخ کے تناظر میں سوچنے کے عادی تھے، اسلام کو وقتی طور پر ظہور میں آنے والی بدعت یا بداعتقادی (heresy) قرار دیا، اور سمجھا کہ ماضی کی دیگر بہت سی بد اعتقادیوں کی طرح اس 'بغاوت' کو بھی مقابلہ کر کے دبایا اور ختم کیا جا سکتا ہے؛ یا پھر اسے اپنی قدرتی موت مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔(۲۲)

پہلا شخص جس نے اسلام کو بطور ایک عیسائی بدعت کے رد کیا، شام کا ایک پادری یوحنا دمشقی تھا۔ وہ مسلم مخالفین کے موجودہ دور تک پھیلے ایک لمبے سلسلے کا باوا آدم ہے، جس میں آرنلڈ ٹوئن بی ہمارے دور کا غالبًا سب سے نمایاں مؤرخ ہے۔(۲۳) یوحنا دمشقی مشرقی چرچ کا مدار المہام تھا، اور اس کی تصنیف "On the Orthodox Faith" اِدھر وہی حیثیت رکھتی ہے جو Thomas Aquinas کی "Summa Theologia" کو مغربی چرچ میں حاصل ہے۔ اس کے 'مناجاتی گیت' یا 'بھجن' (hymns) تاحال گائے جاتے ہیں۔ یہ دمشقی ماہرِ لاہوت عربی زبان جانتا تھا، اور قرآن کا مطالعہ کر رکھنے کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلامؐ کی سوانح حیات سے بھی واقف تھا۔ 'رہبانی سلسلے' میں شامل ہونے سے پہلے وہ اپنے والد اور دادا کی طرح اُمَوی دور کے ابتدائی حصے میں ایک انتظامی عہدے پر فائز رہا۔ اسے اس بات سے بڑا دھچکا لگا کہ عیسائی اسلام کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ تبدیلیِ

مذہب کی لہر کو روکنے کے لیے اس نے عملی اقدامات کیے۔ الٰہیات کے محاذ پر بظاہر معذرت خواہانہ مگر شدید نوعیت کے حملے کا آغاز کیا، جس میں مسلمانوں کے لیے اسلام کو غلط ثابت کرنے سے زیادہ عیسائیوں کے لیے اس کی غلطی واضح کرنے پر توجہ مرکوز کی گئی تھی۔ اس مہم نے بعد کے مسلم مخالف مناظرہ جات کے لیے راہ ہموار کی۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یوحنا دمشقی کو اپنے عقیدے کے دفاع اور اسلام پر تنقید کرنے کی آزادی ایک مضبوط اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ حاصل رہی۔(۲۴)

آٹھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں مسلمانوں نے جب اسپین فتح کیا، تو اسلام مغربی تاریخ میں ایک اہم شراکت دار کی حیثیت اختیار کر گیا۔ یورپ نے عسکری اور متکلمانہ، ہر دو محاذوں پر اس کا جواب دیا۔عسکری ردِّعمل (بعینہٖ مسلمانوں کے یورپ میں پہلے نفوذ کے مانند) اس وقت اپنی انتہا کو جا پہنچا جب 732ء میں Poitiers کے نزدیک Tours کے مقام پر مسلمانوں نے فرانسیسی حکمران Charles Martel (جو Charlemagne(۲۵) کا دادا تھا) کے ہاتھوں شکست کھائی۔ جبکہ مسلم اسپین میں اس کے بعد کوئی چار صدیوں تک عیسائیوں، مسلمانوں اور یہودیوں، نیز عرب، بربر اور یورپی باشندوں کے درمیان مذہبی اورنسلی ہم آہنگی کا دور دورہ رہا۔ اس ہم آہنگی کے نتیجے میں ادب، موسیقی، سائنس، تجارت، فنِ تعمیر اور تقابلی ادیان کے مطالعے کو بے مثال فروغ حاصل ہوا۔ ایک مرکب ثقافت کی شکل میں حاصل ہونے والی اس تہذیبی ترقی کے حیران کن آثار، اصیل فنِ تعمیر کی صورت میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں، جس میں اسلامی اور بازنطینی طرزِ تعمیر کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ قرطبہ کی عظیم مسجد، Seville کا قصرِ مَلِکی (Alcazar) اور غرناطہ میں الحمرا کا محل اس کی یادگار ہیں۔

مغربی اسکالرمسلم اسپین میں اسی طرح جمع ہو گئے تھے جیسے مسلمان طلبہ موجودہ دور میں حصولِ علم کے لیے مغرب جاتے ہیں۔ اسپین کے سارے باشندوں کے لیے ذریعۂ تعلیم، باہم رابطے، نیز ادب، ثقافت اور فلسفے کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ تفریحی فنون کی زبان بھی عربی ہی تھی۔ قدیم یونان اور ہندوستان کا سائنسی ورثہ جو عربی زبان میں منتقل کیا گیا، اور جسے مسلمانوں نے تخلیقی سطح کے اضافے کے ساتھ پروان چڑھایا، اسے لاطینی تراجم کے ذریعے یورپ کی بیشتر اقوام نے اپنایا اور مزید آگے بڑھایا۔ یوں اس نے یورپی نشأتِ ثانیہ کے ظہور میں بنیادی کردار ادا کیا۔ کثیر المذاہب، کثیر العناصر مسلم اسپین کا تہذیبی کردار، ثقافتی مظاہر سے لے کر زراعت تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک طرف موسیقی اور شاعری(۲۶) میں نئی طرز اور اصناف کا اضافہ ہوا، تو دوسری جانب پھلوں اور سبزیوں میں نئی اقسام دریافت کی گئیں جو اہلِ مغرب کو منتقل ہوئیں۔ مغرب کی سرزمین پر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان

بقائے باہمی کا یہ پہلا تجربہ تھا جو ایک لمبی پھیلی ہوئی عسکری جد ّو جہد کے بعد اسپین کے دوبارہ عیسائیوں کے قبضے میں چلے جانے سے اپنے اختتام کو جا پہنچا۔ 1492ء میں غرناطہ کا سقوط اس 'فتحِ بازیافت' (Reconquista) کا فیصلہ کن معرکہ تھا۔

اس 'فتحِ بازیافت' کے وقت تک بہت سے عیسائی اور یہودی اسلام قبول کر چکے تھے۔ خود بائبل کا عربی ترجمہ، مشنری مقاصد سے زیادہ اندلس کے عیسائی باشندوں کے لیے کرنا پڑا جو اب لاطینی زبان تقریباً بھول چکے تھے۔ وقت کے ساتھ عیسائی دنیا پر یہ کھلا کہ اسلام کوئی نئی عیسائی بدعت یا بداعتقادی نہیں، بلکہ وہ ایک ظفر مند مقابل مذہب تھا۔ ایک دفعہ یہ بات واضح ہو گئی تو پرامن بقائے باہمی کا نظریہ موقوف ہو گیا(۲۷)، اور اسلام کے خلاف مذہبی، الٰہیاتی نوعیت کی جوابی مہم کو عسکری کارروائیوں سے زیادہ قوت اور شدت کے ساتھ آگے بڑھایا گیا۔

یوحنا دمشقی کی بِنا کردہ مناظرانہ مہم کو نئے سرے سے شروع کیا گیا۔ مطلق جہالت اور فتح یاب اسلام سے بے انتہا خوف کے اشتعال انگیز مرکب کا برگ و سامان لیے مسیحی مناظرانہ تقریر وتحریر انتہائی زہرآلود طعن وتشنیع کا رنگ اختیار کر گئی۔ پیغمبرِ اسلامؐ اور ان کے پیغام کی نہایت جامد اور جارحیت کی حامل مسخ شدہ تصویر پیش کی جانے لگی۔ قرآن کو یہودی اور عیسائی صحائف و کتب کا ایک جعلی اور تحریف شدہ نسخہ، اور نتیجتاً یکسر غلط قرار دیا گیا۔ ان کے نزدیک وہ وحی جو عیسائیت کے بعد نازل ہوئی، لامحالہ غلط تھی۔ اسلام کی تصویر ایک ایسے مذہب کے طور پر کی گئی جو تشدد، بت پرستی اور اباحیت پسندی کا قائل ہے۔ مسلمانوں پر پیغمبر محمدؐ اور وثنی دیوتاؤں کی پوجا کا الزام لگایا گیا۔ پیغمبرِ اسلامؐ کو ایک مکار سیاست دان، جنسی ہوس کار، افترا پرداز اور نفرت انگیز، مسیح مخالف شخصیت بنا کر پیش کیا گیا(۲۸)۔ حیثیتِ عرفی مجروح کرنے والے ان جھوٹے الزامات اور بے بنیاد دعووں کے اثرات آج تک محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

گمراہ کن معلومات، بے بنیاد پروپیگنڈا اور نفرت انگیز تصویرکشی کے اس ماحول میں داخلی سیاسی اور معاشی عوامل نے یورپ کی آشیرباد کے ساتھ مسلم دنیا کے خلاف قرونِ وسطٰی کی پہلی صلیبی جنگ آغاز کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ صلیبی جنگیں صدیوں چلتی رہیں۔ پہلی صلیبی جنگ 1095ء میں شروع ہوئی، اور اس کے فوراً بعد یروشلم کا سقوط عمل میں آیا، جسے صلاح الدین ایوبی نے تقریباً ایک صدی بعد واپس حاصل کیا۔ اگرچہ صلیبی حملہ آور 1291ء میں مسلم علاقوں سے نکال دیے گئے، لیکن چھوٹی بڑی جنگوں کا سلسلہ 1396ء تک جاری رہا، جب عثمانی اتراک (جو تاریخ میں سب سے مضبوط

اور متاثر کن جنگی نظام کے خالق تھے)(۲۹) نے Danube کے کنارے، Nicopolis کے مقام پر ایک لاکھ صلیبی حملہ آوروں کی پوری فوج کو مکمل طور پر کچل دیا، اور یوں آخرِ کار مغربی حملہ آوروں کی ہمت توڑ دی۔ 1453ء میں ناقابلِ تسخیر قسطنطنیہ (جسے پہلی مسلم حکومتیں سر نہ کر سکی تھیں) پر عثمانیوں کا قبضہ، نہ صرف کئی صدیوں تک مسلم خطوں کو مغرب کی غارت گرانہ کارروائیوں سے محفوظ رکھنے کا باعث بنا، بلکہ مغرب سے مسلمانوں کے تعلق کی نوعیت اور طاقت کے توازن میں تبدیلی کا بھی موجب ٹھہرا۔

عثمانیوں کے قسطنطنیہ میں فاتحانہ داخلے اور اس کے بعد مشرقی یورپ میں ان کی عسکری کامیابیوں نے خوف کی ایک پر اضطراب اور اشتعال پذیر صورتِ حال کو جنم دیا۔ پہلے کی طرح یہ خطرہ بھی مذہبی کے ساتھ ساتھ عسکری اور سیاسی نوعیت کا حامل تھا، اور اس کا نتیجہ اسلام کی نئے سرے سے مسخ شدہ انداز پر تصویرکشی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ مسلم دشمنی، عثمانیوں کی آٹھویں صدی کے اواخر میں پے در پے شکستوں اور ان کی عسکری قوت کا سورج غروب ہو جانے کے بعد بھی خاصی قوی رہی۔ 1699ء میں Karlowitz کے مقام پر عثمانیوں کو ذلت آمیز معاہدے پر مجبور کرنے کے بعد مغرب اب ان سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا(۳۰)۔ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ مغرب مسلمانوں اور ان کی تہذیب کے احترام سے بھی عاری ہو گیا۔

اس طرح 1699ء کا سال مسلم مغربی تعلقات کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ عثمانیوں کے اس معاہدے سے مغرب کے ہاتھوں پوری مسلم دنیا کی تذلیل اور شکست وتسخیر کا آغاز ہوا۔ مسلم دنیا کے ایک بڑے حصے کے اندرونی معاملات میں پہلے آہستہ رو تجارتی، سیاسی، اقتصادی اور مذہبی دخل اندازی کے ایک بھر پور عرصے کے بعد مغربی استعمار نے انیسویں صدی سے باقاعدہ آغاز کیا، اور براہِ راست یا بالواسطہ تمام مسلم ممالک پر عملی لحاظ سے غلبہ حاصل کر لیا۔ حتیٰ کہ دولتِ عثمانیہ سے الگ دیگر دو بڑی مسلم ریاستیں: مغلیہ ہندوستان اور قاچاری ایران بھی، جو جغرافیائی لحاظ سے مغرب سے متصل نہیں تھیں، مغربی تسلط کا شکار بنیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں مغرب اور مسلم دنیا کے درمیان تعلقات کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے، (اور اس دور کی تاریخ لکھنا ابھی باقی ہے)۔ یہ مغرب کی عالمی توسیع پسندی کا زمانہ رہا۔ یہ زمانہ مغرب کی عسکری، سیاسی، نظریاتی، تکنیکی، معاشی اور ثقافتی طاقت کی برتری کے لحاظ سے پہچانا جاتا ہے۔ مغربی استعمار نے اپنی سابقہ اشتمالی شاخ کے ساتھ مل کر ایک وسیع جال پھیلایا اور کرۂ ارض کے ایک بڑے حصے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس نے تمام مسلمان ممالک کو متاثر کیا، بدیں طور کہ ان

چند ایک بچے کھچے خطوں میں بھی اپنا اثر و نفوذ محسوس کرایا جو خود مختار رہے تھے۔

۳۔ مسلم مغربی تعلقات کے لیے کامیاب نسخہ

جدید دور میں مغرب کی مسلم دنیا میں دخل اندازی کے حقیقی محرکات مختلف عوامل کا ہم آمیز مجموعہ رہے ہیں۔ ان محرکات میں ناقابلِ سیری طمع، طاقت کی ہوس اور احساسِ برتری شامل ہیں۔ قدرے سادہ، غیر محاکماتی انداز میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مغرب کو معاشی، سیاسی اور قومیتی عوامل نے انگیخت کیا، اور اس کی اولین کامیابیوں میں مسیحی مشنری جوش و خروش بھی شامل رہا۔ پچھلی کچھ دہائیوں میں مسلم اقوام سمیت، استعمار کی محکوم تمام قوموں نے سیاسی آزادی کے دوبارہ حصول اور اپنی قسمت کے کسی حد تک آپ مالک ہونے کی خاطر سخت جدّ و جہد کی۔ سیاسی آزادی کا حصول تو [کسی طور اور کسی قدر] ممکن ہوا، مگر اپنی قسمت کے فیصلے آپ طے کرنے کی بات باعث نزاع رہی، کہ مغرب ابھی تک وہ اہم سیاسی، عسکری اور معاشی فوائد محفوظ اور برقرار رکھنا چاہتا ہے جو اس نے اپنی طاقت کے عروج والے بھلے دنوں میں حاصل کیے تھے۔ مزید برآں، وہ اپنے ثقافتی، سیاسی اور معاشی تصورات ایک ایسی غیر مغربی دنیا پر نافذ کرنا چاہتا ہے جو ان امور میں اپنے نظریات رکھتی ہے۔ تاہم، اس سمٹتی ہوئی، مائل بہ تشدد دنیا میں قوموں اور تہذیبوں کی پرامن باہمی بقا، انسانی اور اخلاقی لحاظ سے ضروری نظر آتی ہے۔ لیکن پرامن بقائے باہمی کا حصول تبھی ممکن ہے جب ساری قومیں اور گروہ یہ محسوس کریں کہ ان کی تذلیل نہیں کی جا رہی، ان کے حقوق محفوظ ہیں، اور وہ انصاف حاصل کرنے میں ناکام نہیں۔ سماجی، سیاسی اور معاشی انصاف، وہ واحد بندھن ہے جو قوموں اور تہذیبوں کو باہم ملاتا اور چین کے ساتھ زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ انفرادی اور قومی سطح پر ہوا و حرص، نیز انتظامی [وسائل و طاقت کا] ضیاع اور [معاشرے میں] پھیلی ہوئی نا انصافی ہی ہے جس کے باعث انسان عزت و آبرو کے ساتھ رہنے کے لیے درکار وسائل اور مواقع کی کمی محسوس کرتا ہے۔

جب سے ریاست ہائے متحدۂ امریکا نے مغربی دنیا کی رہنمائی کا منصب سنبھالا اور دوسری عالمی جنگ کے بعد ایک 'سپر پاور' بن کر ابھری ہے، ایک اضطراب انگیز اور رخنہ انداز عنصر، مغرب کے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات میں حائل ہو چکا ہے۔ یہ اضطراب انگیز، رخنہ انداز عنصر امریکا کی اسرائیل کے ساتھ 'جذباتی وابستگی' ہے۔ اسرائیل کی ریاست مسلم دنیا کے سر پر بزورِ قوّت ایک ایسے عمل کے ذریعے لاگو کی گئی جو نہ صرف انسانی جانوں کے ضیاع، بلکہ بے گھری، ظلم و تعدی، مصائب و آلام اور لاکھوں فلسطینیوں کے بنیادی انسانی حقوق غصب کیے جانے کی شکل میں ظاہر ہوا۔(۱۳) مغرب کا

اسرائیل کے قیام، اس کی پشت پناہی اور تحفظ کے سلسلے میں بنیادی کردار ادا کرنا، نیز اس کی جارحانہ پالیسیوں کی بے جا، اندھی حمایت نے 'دشمن مغربی دنیا' کے بارے میں بعض مسلمانوں کے پرانے خدشات کی تصدیق کی ہے۔ مسلم دنیا کے مغرب کے ساتھ تعلقات کو کسی اور قضیے نے اس قدر نقصان نہیں پہنچایا جتنا اسرائیل کے مسئلے پر مغرب کے موقف نے متأثر کیا۔ اسرائیل کی محارب، جارحیت پسند اور توسیع پسندانہ صہیونی ریاست (جو جمہوریت اور انصاف کے اصول و نظریات اور اقوامِ متحدہ کے دستور کا مذاق اڑانے کے علاوہ آج کے دور میں ریاستی دہشت گردی کے نظریے پر عمل پیرا پہلی ریاست ہے)، اسے مغرب سے بہم پہنچنے والی بے حد و حساب، ناجواب دہ معاشی اور عسکری امداد، دنیا کے ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں کے جسم و جان میں خار بن کر پیوست ہے۔ مسلمان بجا طور پر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ: اقوامِ متحدہ کا کون سا رکن اس کے دستور کا اسرائیل سے زیادہ خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہے، جس نے نہ صرف گرفت کے خوف سے آزاد ہو کر دیدہ دلیری کے ساتھ، بلکہ امریکا کی واضح اور پیہم مدد کے بل بوتے پر ایسا کیا؟'' اسرائیل کے علاوہ کوئی ملک ایک پوری قوم کے قتل کا گھناؤنا جرم، گرفت و سزا سے آزاد رہ کر نہیں کر سکتا۔

انصاف کی کم یابی یا اس کم یابی کا احساس ہی وہ چیز ہے جو آج مسلمانوں اور مغرب کے درمیان کھچاؤ کا سبب ہونے کے ساتھ ساتھ خود مسلم معاشروں میں داخلی تناؤ کا باعث ہے۔ مسلمان مغرب سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آزادی، جمہوریت اور مساوات کے ان اصولوں کی پاسداری کرے گا جو عام طور پر وہ اپنے ہاں بروئے کار لاتا ہے، اور جنھیں وہ باقی دنیا کو فراہم کرنے اور نافذ کرانے کی نیک خواہش کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس قسم کے دعوے مسلمانوں کو کھوکھلے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مغرب کا مذکورہ اصولوں کی حمایت اور پاسداری کرنا، انتخابی نوعیت اور منافقانہ طرزِ عمل کے ساتھ ساتھ متعصّبانہ نقطۂ نظر لیے ہوئے ہے۔ یہ بڑی حد تک خالص ذاتی مفاد، نام نہاد حقیقت پسند، مگر غیر اصولی سیاست اور پرانی، لیکن معاندانہ طرزِ فکر کی حامل بے وجہ کی عداوتی سوچ پر مبنی ہے۔ مسلمان اپنے ملکوں اور معاشروں پر نظر ڈالتے ہیں، جو آزادی، جمہوریت اور مساوات کی جستجو میں مغرب کی وجہ سے ناکام ہوئے ہیں، تو انھیں زیادہ دور نہیں جانا پڑتا۔ ان کے سامنے ایک طرف فلسطینیوں، کشمیریوں اور فلپینیوں کی مثال ہے، اور دوسری سمت بوسنیا، ہنگری، شیشان، کوسوو اور مائنامار کے مسلمانوں کی حالتِ زار ہے، جو منظرِ عام پر نہ آنے والی ظالمانہ کارروائیوں کا نشانہ بنے۔ مسلمان دریافت کرتے ہیں کہ: ''ان لوگوں کی اکثریت اگر عیسائی یا یہودی ہوتی، تو کیا مغرب ان کے دفاع اور تحفظ کے لیے فوراً نہ جا پہنچتا؟ کیا مغرب کے عیسائیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے حقوق اس

قدر کم اہمیت کے حامل ہیں کہ انھیں ناقابلِ توجہ سمجھا جائے؟''(۳۲) مسلمانوں کے حقوق، خواہ غیر مسلم پامال کریں یا وہ آمرانہ مسلم حکومتوں کے ہاتھوں روندے جائیں، مغرب اس سلسلے میں بالکل اندھا اور بہرا بن جاتا ہے۔ مسلمانوں کو مغرب کے آزادی اور جمہوریت کے نام پر اختیار کردہ اس طرزِ عمل میں تضاد نظر آتا ہے کہ ایک طرف وہ مائنامار کے ایک اکیلے حزبِ مخالف کے رہنما کے آزاد اور سیاسی طور پر سرگرم رہنے کی بے دریغ حمایت کرتا ہے، جبکہ دوسری طرف انھی حکومتوں کاان ہزاروں مسلمانوں کو گرفتار اور حرّیتِ اظہار سے محروم کرنا مغرب کی غیر محسوس خاموش تصدیق کا مورد قرار پاتا ہے، جو اسی طرح اظہارِ رائے کی آزادی کے طلب گار ہیں، جس کے تحت کم سے کم خود اپنے ممالک میں اپنے عقائد و نظریات کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔ مغرب کا دہرا معیار اور دنیا کے بہت سے خطوں میں مسلمانوں کو درپیش مشکل صورتِ حال پر اس کا لاتعلقی اور بے نیازی کا حامل رویہ، باہمی تعلقات میں تناؤ اور مسلمانوں کے ہاں مغرب مخالف جذبات پیدا کرنے کا موجب بنا۔ مسلمانوں اور مغرب کے مابین تعلقات میں بہتری صرف اسی صورت میں آ سکتی ہے اگر مغرب انصاف اور جمہوریت کے مسئلے پر بے لاگ اور متوازن موقف اختیار کرے، جو اس کے خود اپنے حمایت کردہ اصولوں میں سے ہے، لیکن جنھیں مسلم دنیا میں بروئے کار لانے کی بجائے مغرب اب تک یہ اصول توڑنے میں فخر محسوس کرتا رہا ہے۔ اگر مغرب واقعتاً ایسا اصولی موقف اپناتا ہے تو یہ حقیقی تعاون اور بقائے باہمی کے ایک نئے عہد کا آغاز ہو گا۔

۴۔ نئی پیش رفت

بیسویں صدی کے اختتام پر مسلم مسیحی تعلقات میں ایک نئے اور امکانی لحاظ سے بہتر مستقبل کی نوید دینے والے دور کا آغاز ہوتا نظر آ رہا ہے(۳۳)۔ مسلمانوں اور اہلِ مغرب کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد دوسرے کے ممالک میں جانے اور فاتح یا صلیبی حملہ آور کے طور پر نہیں، بلکہ وہاں [عارضی یا مستقل طور پر] رہنے کے لیے آمادگی کا اظہار کر رہی ہے۔ عثمانیوں کے دور میں مشرقی یورپ کے باشندوں نے اسلام قبول کیا، اور اپنے علاقوں میں ایک وقت کے طاقت ور اشتمالی غلبے کے باوجود اس پر قائم رہے۔ تاہم، مغربی یورپ میں مسلمانوں کی تعداد انتہائی کم ہو گئی، اور اسپین کی چند صدیاں پیشتر 'فتحِ بازیافت' (Reconquest) کے بعد وہاں ان کا وجود صرف ایک کم زور اور علیحدہ اقلیت کے طور پر باقی بچا۔ اس لمبے انقطاع کے بعد انیسویں صدی کے اواخر، اور خاص طور پر بیسویں صدی میں مسلمانوں نے شمالی و جنوبی امریکا سمیت مسیحی مغرب میں دوبارہ اپنا پرامن وجود استوار کیا ہے۔ مغربی باشندے صلیبی حملوں اور استعمار کے دوران بھی مسلم ممالک میں مقیم رہے، مگر وہ بن بلائے مہمان تھے

اور عام طور پر مقامی مسلمان آبادی سے الگ رہے۔ البتہ، اب یہ پہلی بار ہوا کہ مسلم ممالک میں رہنے والے مغربی لوگ اور مغرب جانے والے مسلمان، دونوں اپنی انفرادی مرضی اور اختیار سے ایسا کر رہے ہیں۔

لاکھوں مسلمان، خواہ مستقل طور پر منتقل ہوئے ہوں یا عارضی تارکینِ وطن ہیں، وہ اب مغرب میں بطور شہری مقیم ہیں۔ وہاں ان کی نئی نسلیں جنم لیں گی اور اس ماحول کی کٹھالی میں ڈھل کر جوان ہوں گی جس میں انھیں شناخت کے کڑے امتحانوں سے گزرنا پڑے گا۔ مزید برآں، ہزارہا مسلمان، بہتر تعلیمی مواقع کی تلاش میں بطور طالبِ علم مغرب میں موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ واپس اپنے ممالک کو لوٹ جاتے ہیں، جبکہ دیگر مستقل طور پر وہاں رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہاں ایک اور توجہ طلب، قابلِ غور صورتِ حال سامنے آتی ہے، اور وہ یہ کہ مغرب میں کئی لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔(۴۴) اس کے مقابل، مسلم دنیا کے تمام علاقوں میں ہزارہا مغربی باشندے اقامت پذیر ہیں۔ وہ بھی یہاں کام کے مواقع تلاش کرتے ہیں۔ کچھ باہمی تعاون کے منصوبہ جات بروئے کار لانے والی حکومتی یا نجی تنظیموں کی نمائندگی کرتے ہیں، جبکہ دوسرے غیر ملکی یا مقامی کمپنیوں میں کام کرتے ہیں۔

یہ تازہ صورتِ حال اور اس میں پنپنے والا عوامی سطح کا بڑھتا ہوا میل جول یقیناً مسلمانوں اور اہلِ مغرب کے ایک دوسرے کے بارے میں قائم کردہ بہت سے غلط تصورات کو ختم کرنے اور نادرست تصویرکشی کی تصحیح کے سلسلے میں رہنمائی کا کام انجام دے گا۔ مغرب کے لوگوں کو براہِ راست گوشت پوست کے مسلمانوں سے ملنے، ان کی انسانیت، ان میں پائے جانے والے تنوع اور اپنائی ہوئی اقدار کو دریافت کرنے کا موقع دستیاب ہو گا۔ وہ خود دیکھ سکیں گے کہ ان کے ہمکاروں اور پڑوسیوں کی بڑی اکثریت قانون کی پابند، نفیس طبع اور خدا خوف لوگوں پر مشتمل ہے۔ وہ مسلمانوں کے مذہبی فرائض اور ان فرائض کے مسلمانوں کی روزمرہ زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں جان سکیں گے۔ مثال کے طور پر مغرب کے لوگ ماہِ رمضان سے آشنا ہوتے جا رہے ہیں، نیز وہ اپنے مسلمان ہم وطن کے لیے پورے ماہ کے روزوں کی اہمیت کو بہتر طور پر سمجھنے لگے ہیں۔ بعض ممالک میں ٹیلی وژن پر ہفتہ وار بین المذاہب مذاکرے منعقد ہوتے ہیں، اور ناظرین کو اکثر یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک خدا پر اعتقاد رکھنے والے مذاہب کے پیروکار باہم کس قدر اشتراک کے حامل ہیں۔ اسی طرح مغرب میں مسلمانوں کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے مثبت عناصر کو بنظرِ استحسان دیکھیں اور انھیں اہمیت دے سکیں، جیسے وہاں کا خوب استوار ادارہ جاتی نظام، جو عام آدمی کی عزت و آبرو کا تحفظ کرتا ہے۔ وہ وہاں عیسائیت کے مثبت سماجی کردار کو بھی اچھی طرح جان

سکتے ہیں، جس کے تحت عیسائیت سے وابستہ ان افراد اور اداروں کی خبر گیری کی جاتی اور خیال رکھا جاتا ہے، جو انسانیت کی فلاح کے کام انجام دے رہے ہوتے ہیں۔ وہ چرچ اور معاشرے کے دیگر لوگوں کے باہم تعاون سے نہایت منظّم اور فعّال انداز میں فلاح و خیر کا فریضہ ایسے ہمدردانہ طریقے سے ادا کرتے ہیں جو صرف گہرے مذہبی جذبے کے تحت عمل میں آتا ہے۔

اس کے مقابل، بہت سے مغربی باشندے جو مسلم ممالک میں کام انجام دے چکے ہوتے ہیں، مسلمانوں کی ثقافت اور ان کے نقطہ ہائے نظر کی ستائش و احترام کا جذبہ لیے اپنے ممالک کو لوٹتے ہیں۔ ان میں سے کئی لوگ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان خیر سگالی کے پیغامبر کا مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ ایسے افراد، خواہ سابقہ سفارت کار ہوں یا مختلف تنظیموں اور اداروں کے ملازم یا اساتذہ، وہ مسلمانوں اور مغرب کے درمیان رابطہ کاری کے لیے بے غرض ہو کر اپنا وقت اور پیسہ بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ کام وہ مختلف لحاظ سے انجام دیتے ہیں؛ جس میں تحریر و اشاعت، چرچ سے منسلک سرگرمیاں، اجتماعی نوعیت کی عوامی مجالس اور ذرائع ابلاغ کے پراگرام؛ نیز تعلیمی اور دیگر متعلقہ اداروں کے ذریعے تعلیم کے حوالے سے دوررس اہمیت کے حامل پروگرام شامل ہیں۔ اپنی انفرادی کوششوں کا دائرۂ کار عام طور پر محدود ہونے کے باوجود، ایسے نڈر، متحرک اور وسعتِ نظر کے مالک افراد مسلم مسیحی تعلقات میں بہتری لانے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ رگ و ریشہ میں پیوست جہالت اور وراثتی تعصب کی قوی لہر کے خلاف لڑتے ہیں، لیکن تمام تر مخالفت اور باعثِ نزاع امور کے باوصف کامیابی ان کا مقدر ہوتی ہے۔ مسلمان، کہیں بھی ہوں، وہ ان کے زیرِ بارِ احسان ہیں۔(۳۵)

تقریباً ہر مغربی ملک میں ایسی مسلم تنظیمیں موجود ہیں جو اپنے معاشروں کی نمائندگی کرتے ہوئے مغربی معاشرے کے بہت سے عناصر کو بات چیت کی دعوت دیتی ہیں، جن میں حکومتی رہنما اور پالیسی ساز حضرات؛ ذرائع ابلاغ، نشر و اشاعت اور تجارتی کمپنیوں کے سربراہان؛ عیسائی اور یہودی مذہبی رہنما؛ نیز تعلیمی اداروں کے سربراہ شامل ہیں۔ یہ نوزائیدہ تنظیمیں مسلمانوں کی حیثیت واضح کرنے، ان کے حقوق کے تحفظ، غلط فہمیاں دور کرنے، ان کے غلط اقدامات کے مداوے، اور باہمی دلچسپی کے معاملات پر دیگر معاشروں اور تنظیموں کے ساتھ تعاون کے سلسلے میں ایک اہم اور مثبت کردار کا آغاز کر رہی ہیں۔ اسی طرح مغرب کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم مسلمان طالبِ علم لامحالہ اپنے مغربی اساتذہ پر اثر چھوڑتے ہیں۔ اس نوعیت کے رابطے طلبہ اور ان کے اتالیق، ہر دو کو نہ صرف تعلیمی، بلکہ زیادہ عمیق انداز میں انسانی سطح پر متأثر کرتے ہیں۔

یہ حقیقت کہ لاکھوں مسلمان مغرب میں مقیم ہیں، نہ صرف مسلم مسیحی تعلقات میں، بلکہ خود مسلمانوں کے لیے بھی بے شمار ضمنی اور داخلی نوعیت کے مسائل ساتھ لیے ہوئے ہے۔ مغرب میں مقیم مسلمانوں کو مغربی ماحول سے مخصوص بہت سے نئے حالات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے، اور اسلام کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا ہوتا ہے۔ یہ صورتِ حال محدود پیمانے پر ان حالات سے مشابہ ہے جو ابتدائی دور کے مسلمانوں کو عراق اور شام کے علاقوں میں آباد ہوتے وقت پیش آئے۔ تاہم ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اُس دور کے مسلمان، ان علاقوں میں نئے اور طاقت ور حکمران کی مضبوط حیثیت کے مالک تھے، اور اس بنا پر تجدید و اختراع کے قابل۔ اس کے مقابل آج کے مسلمان، مغرب میں ہوں یا کہیں اور، وہ مسلسل حقیقی یا تصوراتی سازشوں کے خوف کے شکار رہتے ہیں، اور اپنی شناخت دوسرے کی گرفت محسوس کرتے ہیں۔

مغرب کے مسلمانوں میں مغربی نومسلم ایک نئے گروہ کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ دولتِ عثمانیہ کی مغرب سے پسپائی کے ساتھ ہی مغربی اقوام کے اسلام قبول کرنے کا سلسلہ عملی طور پر رک گیا تھا۔ اب جبکہ معلومات کی عالمگیریت کا دوردورہ ہے، خالص مادی نظام سے مایوسی کی پیدا کردہ روحانی طلب، نیز مسلمانوں اور اہلِ مغرب کے درمیان وسیع پیمانے پر پروان چڑھنے والے شخصی روابط کے زیرِ اثر مغربی ممالک میں کئی عیسائی، یہودی، لاادریّین اور ملحد تک اسلام قبول کر رہے ہیں۔ ایسے نومسلموں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے، خاص طور پر ریاست ہائے متحدۂ امریکا میں جہاں بہت سے سیاہ فام باشندے اسلام قبول کر چکے ہیں۔ ان میں سبھی شعبہ ہائے زندگی کے افراد شامل ہیں: عام مرد اور خواتین، جیلوں میں قید مجرم، مقبولِ عام گلوکار، مکّا بازی کے عالمی چیمپئن، ادیب، طبی ماہرین، دانش گاہوں کے اساتذہ، سیاہ فام رہنما، راہب حضرات، جرمن سفارت کار، برطانوی ممبرانِ پارلیمنٹ، فرانسیسی مفکرین؛ نیز کئی برطانوی، ہنگری اور فرانسیسی مستشرقین بھی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اس سلسلے کی اہم بات، نمایاں حیثیت اور نہایت واضح موقف و آواز کے حامل دانشوران کا قبولِ اسلام ہے، جو اسلام کی عالمی اخوت کے پیغام کو اپنی نہایت معیاری اور اصالت کی حامل علمی، مخلصانہ اور فکری نوعیت کی کوششوں کے ذریعے زیادہ با وقعت بنا رہے ہیں۔ انگریزی زبان میں لکھی گئی تحریروں میں محمد Marmaduke Pickthal، محمد اسد اور Thomas Irving، ہر سہ نے قرآن کو انگریزی میں منتقل کرنے کے لیے عرصۂ دراز پر محیط سخت (مگر اپنے لگاؤ پر دلالت کرنے والی) مشقت اٹھائی۔

مغرب کے مسلمان، خود کو، نیز دنیا بھر کے مسلمانوں کو درپیش مسائل کے سلسلے میں وقت آنے پر

یقیناً اپنی آواز بلند کرنے کے قابل ہوں گے۔ تاہم، اگر وہ اس انداز میں تجدید کا کام انجام دیتے ہیں، جو مسلم تہذیب کی روح کے خلاف پڑتا ہو، تو اس تجدید میں ان کا حصہ انتہائی کم اہمیت کا حامل، ثانوی نوعیت کا رہے گا، اور باقی مسلم دنیا پر اس کا اثر نہ ہونے کے برابر ہو گا۔ لیکن اگر وہ یہ تجدید و ابداع اس طور پر انجام دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی اور فکری روایت سے اس کا تعلق برقرار رہے، تو ان کا اس سلسلے میں اصالت کا حامل کردار ہر جگہ کے مسلمانوں کے لیے فکر و عمل کو زیادہ با وقعت بنانے کا باعث ہو گا۔ وہ یقیناً ایسے ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں جو تخلیقی صلاحیت کو پروان چڑھانے میں معاونت کرتا ہے۔ نیز وہ اس محدود ذہنی افق کی بندش سے دور ہیں جو کئی مسلم ممالک میں غلبہ حاصل کیے ہوئے ہے۔ یہ ایک یقینی امر ہے کہ علم پر کسی ایک مسلم قوم یا معاشرے کی ذاتی اجارہ داری نہیں۔ مسلم تہذیب رنگ و اشکال کی دھنک سے بنے ایک ایسے کھلتے پھیلتے جاذبِ قلب و نظر، عالی شان پارچے سے مشابہ ہے جس کی بنت میں ان گنت قوموں کا ہاتھ شامل رہا ہے۔ مغرب کے مسلمانوں میں یہ صلاحیت بدرجۂ اَتم پائی جاتی ہے کہ وہ اس مصوَّر و مشجَّر، نادرہ کاری کے بافیدہ پارچے کو اور زیادہ شان شوکت بخشیں۔

۵۔ استشراقی مطالعہ جات کی اصل و نہاد پر ایک نظر

مسلمانوں اور مغرب کے درمیان فہم و افہام کا سفر تقریباً ایک ہزار سال پیشتر آغاز ہوا۔ یہ ایک انتہائی آہستہ رو، حد درجے دشوار اور بسا اوقات خطرات سے پر ان جانی صورتِ حال سے دوچار کرنے والا سفر تھا۔ اس نے بہت سے غلط موڑ مڑے۔ یہ ابھی تک طوفان کے تیور لیے ہوئے ہے۔ مگر اب درست سمت میں پیش رفت ہو رہی ہے، اور کئی میدانوں میں اس کی رفتار کافی تسلی بخش ہے۔ تاہم، راستے میں آگے ایسے سمندر بھی آتے ہیں جو ملاّحوں کے نقشے میں نہیں پائے جاتے۔

مسلمانوں اور مغرب کے مابین سلبی نوعیت کا ابتدائی رابطہ، صلیبی جنگوں کی کھونٹی کے گرد گھومتا رہا۔ یہ 'مقدس جنگیں' آپس میں فہم و افہام کی بہتر صورت کو جنم نہیں دے سکیں۔ ہاں، یہ ضرور ہوا کہ اہلِ یورپ ایک ایسی ثقافت سے روشناس ہوئے جو انھیں اپنی ثقافت سے بڑھ کر محسوس ہوئی۔ بلکہ مسلمانوں کی معنوی فتوحات نے چرچ کے ذہین لوگوں میں اس بات کا ادراک پیدا کیا کہ اپنے عقیدے کے دفاع اور مسلمانوں میں عیسائیت کا پیغام پھیلانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ دشمن کے طریقۂ کار کو سمجھیں، جس کے لیے انھیں فکری لحاظ سے مسلح ہونا پڑے گا۔ اس طرح مغرب میں اسلام کے مطالعے کا آغاز ہوا، جس کے دو مقاصد تھے: معذرت خواہی اور دعوت و تبلیغ۔ اسلام کے

مغربی مطالعوں کا بڑا حصہ ابھی تک اس مذہبی عداوت اور عسکری آویزش کے دور میں سانس لیتا، اُنھی ختم نہ کیے جا سکے تصورات کی بنیاد پر استوار ہے۔ تاہم، [محققین] اس گروہ میں سے کچھ صاف ذہن لوگوں نے، استشراقی مطالعہ جات کے آغاز میں لاگو کی گئی حد بندیوں سے آزاد ہونے کی کوشش ضرور کی ہے۔

اسلام کے مطالعے میں دلچسپی لینے کے اولین نتائج صلیبی جنگوں کے دوران ہی ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ فرانس میں Cluny کے با اثر رہنما Peter the Venerable نے ایک برطانوی Robert of Ketton کو قرآن کی تعلیمات کا رد کرنے کے لیے اس کا لاطینی زبان میں، پہلا واضح ترجمہ کرنے کی ہدایت کی۔ یہ ترجمہ 1143ء میں مکمل ہوا۔ اس قسم کے عداوتی مقصد کے تحت کیا جانے والا ترجمہ، ظاہر بات ہے، اصل کے مفہوم کو دیانت دارانہ انداز سے دوسری زبان میں منتقل نہیں کر سکتا، اور نہ یہ اسلام کے بارے میں معلومات کا ایک قابلِ اعتماد ذریعہ بن سکتا ہے۔ مذکورہ ترجمہ اسی نوعیت کا تھا۔ قرآن کا اغلاط سے پر یہ لاطینی روپ دوسری یورپی زبانوں میں صدیوں تک قرآن کے تراجم کی بنیاد رہا۔ Abbot of Cluny نے اسی انداز کا اسلام مخالف مناظرانہ مواد بھی ترتیب دیا جو اسپین میں عربی سے ترجمہ ہو کر پھیلا۔

ایک وقت میں، اس امید پر کہ مسلمان ''کافروں'' کو عیسائیت کے ذریعے نجات دلائی جا سکتی ہے، عربی زبان سیکھنے کے رجحان کو فروغ ملا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں پادری حضرات اسلام کی مقدس زبان اور اس کے عقائد و نظریات پر حاوی ہونے کی انتہائی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال اسپین کے جزیرہ Majorca کے ایک پرجوش پادری Raymond Lull کے حیات و آثار ہیں۔ اس بات کا حتمی یقین کر لینے سے پہلے کہ مسلمانوں کو طاقت سے زور سے مجبور کیے بغیر کبھی بپتسمہ نہیں دیا جا سکتا، Raymond کا خیال تھا کہ عیسائی مشنری اگر اپنے آپ کو مسلمانوں کے دین اور کتاب کے علم سے مکمل طور پر لیس کر لیں تو وہ اپنے مذہبی مدِّمقابل کو گفتگو اور بحث و دلیل کے ذریعے عیسائی بنا سکتے ہیں۔ ان مشنری مقاصد کے لیے تیرھویں صدی عیسوی میں ڈومینیائی (Dominican)(۳۶) اور فرانسیسیائی (Franciscan)(۳۷) اہلِ کنیسہ کے ہاں عربی زبان کی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا گیا۔

عربی زبان اور اسلام کا مطالعہ جلد ہی سیاسی، سفارتی اور معاشی محرکات کی بنا پر بھی بروئے کار لایا جانے لگا۔ تاہم، خاص اہلِ کنیسہ کی اجارہ داری میں ہونے کے لحاظ سے مطالعۂ اسلام، اسلام

مخالف مخصوص 'تصورِ کائنات' (Weltanschauung) اور تعصب ہی کی تحویل میں رہا۔ لیکن اس سب کے باوجود، یہ حقیقت ہے کہ اصل عربی مصادر کے مطالعے کا آغاز ہو چکا تھا، اور یہ اسلام کی تفہیم کو درست بنیادوں پر اٹھانے کی سمت ایک اہم اقدام تھا۔ مذہبی متون کے اس بلاواسطہ مطالعے کے سبب، 'قرونِ وسطیٰ' میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں قدرے نئے اور غیر متعصب نظریات مغرب میں پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ چرچ کی حیثیت مجروح ہونے کے خوف سے ان کا اظہار و ابلاغ محتاط انداز میں ہوا۔

سولھویں صدی عیسوی میں اصلاحِ کلیسا (Reformation) کے آغاز نے عجب ستم ظریفی کا مظاہرہ کیا، کہ اسلام کو چرچ کی داخلی فرقہ جاتی لڑائی میں گھسیٹ کر اس کی ساکھ کو نقصان پہنچایا۔ 'اصلاحِ کلیسا' کے رہنماؤں، بلکہ اس سمت میں ان کے پیش رو John Wycliff نے بھی اسلام کو 'رومن چرچ'، اور پیغمبرِ اسلامؐ کو پاپائے اعظم (جسے Luther کے پیروکار مسیحؑ مخالف کہہ کر موردِ مذمت ٹھہراتے تھے) سے تشبیہ دی۔ دوسری طرف کیتھولک عیسائیوں نے بھی اسلام کو اپنے مخالف فرقہ جاتی نظریے Calivinism کے ذیل میں رکھتے ہوئے یکساں شدت کے ساتھ رگیدا۔

'اصلاحِ کلیسا' کی تحریک نے عہدنامۂ قدیم کے لسانیاتی مطالعے میں بھی دلچسپی لی۔ اس غرض کے لیے عربی زبان کا تاریخی و تقابلی مطالعہ (Philology) بھی بروئے کار لایا گیا، تاکہ توأم سامی زبان ہونے کے لحاظ سے وہ بائیبل کی عبرانی زبان کو مادے (root) اور اشتقاق کی سطح پر سمجھنے میں مدد دے۔ تاہم، شروع میں عربی اور مسلمانوں کی دیگر زبانیں (جیسے فارسی اور ترکی) سیکھنے کا رجحان، اسلام کے بارے میں ہمدردانہ رویے کو ظاہر نہیں کرتا۔ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے عقیدے کی مخالفت اور رد میں بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں، بالخصوص جرمنی میں جہاں Luther کا اسلام مخالف ورثہ نہایت قوی اثر کا حامل تھا، اور ترکوں سے (جن کا نام یورپ میں اسلام کے مترادف تھا) بے اندازہ نفرت پائی جاتی تھی۔ ترکوں سے خوف (Turkophobia) اور اسلام سے طبعی نفرت کی شدت، سترھویں صدی عیسوی کے آخری حصے میں عثمانی اتراک کی فوجی طاقت کا سورج غروب ہونے کے بعد بھی بدستور قائم رہی۔

'قرونِ وسطیٰ' سے لے کر عربی زبان نے محققین کی توجہ اس طور پر مبذول نہیں کی جیسے سترھویں صدی عیسوی میں ہوا، جب تجارتی، سیاسی اور مشنری مقاصد نے یورپ کو آمادۂ جستجو کیا۔(۳۸) آکسفورڈ اور کیمبرج ایسی یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے لیے پروفیسری کے باوقار عہدے رکھے گئے۔ Henry

Stubbe جیسے چند ایک یگانۂ روزگار اہلِ علم نے سترھویں صدی میں بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کے بارے میں بے لاگ تحریریں رقم کیں، لیکن وہ اپنی زندگی میں انھیں شائع کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ خود Stubbe کی تصنیفات بیسویں صدی سے پہلے منصّۂ شہود پر نہ آ سکیں۔(۳۹)

غیر مغربی تہذیبوں اور دیگر مذہبی روایات کے سلسلے میں یورپ کے 'عہدِ روشن' (Age of Enlightenment)، بالخصوص اٹھارویں صدی کے فرانس میں علمی اور تحقیقی رویہ بڑے پیمانے پر تبدیلی سے آشنا ہوا۔ 'روشن خیالی' نے مغرب میں بے شمار لوگوں کو مذہبی تعصب کی بیڑیاں توڑنے پر آمادہ کیا۔ بہت سے یورپی اسکالروں نے اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کے بارے میں کسی قدر معروضیت اور احترام کے ساتھ مطالعے کا آغاز کیا۔ 1694ء میں پہلی دفعہ یورپ میں قرآن کا اصل متن شائع ہوا، اور قرآن کے تراجم براہِ راست اس عربی متن کو سامنے رکھ کر کیے گئے۔ اسلام اور اس کی تاریخ پر اصل مصادر سے استفادہ کرتے ہوئے کتابیں تصنیف ہوئیں، جس سے پرانی اغلاط کی تصحیح عمل میں آئی۔ لیکن اس کے باوجود، اس دور میں اسلام کے بارے میں ہمدردانہ تحریروں کے لیے انتہائی ہمت درکار ہوتی تھی۔ یہ مذہبی قدامت پسندی کا دور تھا، جب بیشتر اسکالر آمدنی کے نہایت باوقار ذرائع رکھتے تھے، اور وہ اپنی روزی اور آزادی کھونا نہیں چاہتے تھے۔ چند ایک دلیر نفوس نے، البتہ، اس جمی جمائی روایت کی خلاف ورزی کی، اور انھیں اپنے نظریات اور تحریروں کی قیمت بھی ادا کرنا پڑی۔ ابھی تک ایسے مصنفین موجود تھے جو تعصب میں غرق مشنری جذبے کے تحت پیغمبرِ اسلامؐ اور ان کی رسالت کے بارے میں زہرآلود تحریریں لکھ رہے تھے۔ مشتے نمونہ از خروارے یہ عنوان دیکھیے: ''ظہورِ کلیِ فطرتِ اصلیِ دجل و فریب در سوانح محمد۔ مع ضمیمہ در براء تِ مسیحیت از ایں اتہام۔ پیش نہادہ برای تأمل و اندیشۂ منکرینِ دیانتِ سماوی در عصرِ حاضر'' (The True Nature of Imposture Fully Displayed in the Life of Mahomet. With a Discourse for the Vindication of Christianity from this Charge. Offered for the consideration of the Deists of the Present Age.)۔(۴۰)

خود Voltaire بھی، جو 'عہدِ روشن' کے ذہین ترین دماغوں میں سے تھا، اسلام کے خلاف 'قرونِ وسطیٰ' کے تعصّبات کا اسیر رہا، اور اسی نقطۂ نظر سے اس پر شدید تنقید کی۔ تاہم، یہ کہہ سکتے ہیں کہ سب کو بلا تفریق ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے والے 'پاپائیت مخالف' نقطۂ نظر نے پہلے سے Voltaire کی سوچ کا رخ متعین کر رکھا تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو محض اہلِ کنیسہ کو چڑانے کی

داخلی تحریک کے زیرِ اثر اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کی تعریف کرتے تھے۔

'اصلاحِ کلیسا' (Reformation) اور 'روشن خیالی' (Enlightenment) سے آغاز کرتے ہوئے یورپ بھر کے محققین نے اپنے اپنے محرکات اور حدود کے پیشِ نظر اسلام کا ایک مذہب اور تہذیب کے طور پر مطالعہ کرنے کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور اسی لحاظ سے عربی اور مسلمانوں کی دیگر زبانوں اور ادبیات کو مطالعے کا موضوع بنایا۔ انھی پیش رس لوگوں کی اٹھائی بنیاد پر انیسویں صدی میں مغرب میں 'اسلامیات' کا مستقل تعلیمی شعبہ قائم ہوا۔(۴۱) جبکہ بیسویں صدی میں 'اسلامیات' میں تخصص رکھنے والے مغربی اہلِ علم کی اتنی بڑی تعداد سامنے آتی ہے جسے بسہولت شمار میں نہیں لایا جا سکتا۔

مسلم محققین 'اسلامیات' کی میدان میں اہلِ مغرب کی غیر معمولی عالمانہ شرکت پر ان کے انتہائی مرہونِ منت ہیں، جو اٹھارویں صدی کے اختتام تک عمومی لحاظ سے Orientalists (مستشرقین) کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ مستشرقین نے سالوں کی سخت محنت سے لسانی تربیت بہم پہنچاتے ہوئے عربی، نیز مسلمانوں کی دیگر زبانوں میں موجود نہایت اہمیت کے حامل بنیادی مصادر کو اعلیٰ علمی معیار کے مطابق مدوّن کر کے شائع کیا۔ یہ بے صلہ، مشقت طلب اور قیمتی کام ایک ایسے دور میں انجام دیا گیا جب مخطوطات تک رسائی اکثر اوقات انتہائی مشکل سے ہوا کرتی تھی، اور اس میں 'الیکٹرونک ٹیکنالوجی' کی مہیا کردہ سہولیات کو مطلق دخل نہ تھا۔ مثال کے طور پر ''تاریخ طبری'' کا نہایت شاندار ایڈیشن Jan de Goeje نے ہالینڈ، جرمنی اور اٹلی کے مستشرقین کی مدد سے بیس سال سے زائد عرصہ میں تیار کر کے شائع کیا۔اس کے بغیر مؤرخین کو اسلام کی پہلی تین صدیوں کے بارے میں بنیادی نوعیت کی معلومات حاصل نہ ہو سکتیں۔(۴۲) اسی انداز پر ''طبقات ابن سعد'' کا Eduard Sachau کا مرتبہ ایڈیشن ہے۔ پھر ''تاریخ ابن اثیر'' کا Carl Tornberg کا مرتبہ ایڈیشن، اور ''سیرت ابن ہشام'' کا Ferdinand Wustenfeld کا ترتیب دیا ہوا ایڈیشن ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے اقوال و افعال اور متعلقہ امور پر مشتمل روایات کی دستی طور پر (؟) ترتیب دی گئی ڈکشنری (concordance)، جسے Arent Wensinck نے شروع کیا تھا، پچاس سال کے عرصہ میں مکمل ہوئی۔ مستشرقین کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع رہا(۴۳)۔ دس جلدوں پر مشتمل مسلمانوں کے سکوں کی مصوّر فہرست، اور بہت سے مسلم خطوں سے جمع کردہ کندہ و منقوش عبارتوں کا کئی جلدوں پر حاوی ایک حیران کن مجموعہ، محض دو مثالیں ہیں جو علم کی راہ میں ان کی اصالت، نیز حفاظت کے جذبے کا پتا دیتی ہیں۔ مستشرقین کے انیسویں صدی کے تدوین کردہ بہت سی کتابوں کے ایڈیشن تبدیل کیے جا سکتے

ہیں نہ ان سے بہتر ایڈیشن سامنے آئے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ ان کی علمی کوششیں امتیازی حیثیت کی حامل ہیں۔ نیز یہ بات بھی ہماری مادی دنیا کی طرف سے ان کے لیے بہت بڑا خراجِ تحسین ہے کہ ان کے مرتب اور شائع کردہ عربی ایڈیشن آج بلا اجازت شائع کے جا رہے ہیں(۴۴)۔

6: استشراق: ارتقا اور مسائل

اگرچہ استشراق (Orientalism) کی بہت سی کامیابیاں ہیں جو احترام کی مستحق ہیں، لیکن مسلم دنیا میں اس کی تصویر داغ دار نظر آتی ہے۔ اس کے بے شمار اسباب ہیں، جن میں ایک سبب ہمکاری کا وہ تعلق ہے جو استشراق، تبشیر (عیسائی تبلیغ) اور خود استعمار کو آپس میں جوڑتا ہے۔ مشنریوں نے اپنے اہداف جلد از جلد حاصل کرنے کے لیے استعمار کے سیاسی اور عسکری مظاہر سے فائدہ اٹھایا؛ بعض مستشرقین نے استعمار کو فکری جواز مہیا کرتے ہوئے اس کی حمایت اور ترجمانی کا حق ادا کیا؛ جبکہ تبشیر نے بہت سی استشراقی تحریروں کو اپنا خاص رنگ دیا، جس کی وجہ سے آج تک انھیں شک و شبہہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کچھ مستشرقین کے اسلام، پیغمبرِ اسلامؐ اور مسلمانوں اور ان کی تہذیب کے بارے میں مسلسل عداوت پر مبنی رویے نے مسلمانوں کے ہاں ان کے بارے میں پریشان کن احساس میں اضافہ کیا۔ وہ پیغمبرِ اسلامؐ، قرآن اور اسلامی اعتقادات و شعائر سے متعلق تاریخی مواد کی مستشرقین کے ہاں پائی جانے والی تشریحات پر اعتراض کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اہلِ مغرب کی یہ تشریحات تحقیق کے غیر متعصب معیار پر پورا اترنے میں بہ تسلسل ناکام رہی ہیں۔ ان الزامات کی صداقت کو صاف ذہن، معتدل مزاج مستشرقین نے بعض دفعہ تسلیم بھی کیا، اور خود بھی اپنے مغربی ہمکاروں کے اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کے بارے میں غیر متوازن مطالعوں پر تنقیدی نظر ڈالی۔(۴۵) اگرچہ مسلمانوں کے بہت سے الزامات درست بھی ہیں، لیکن یہ نا انصافی ہو گی کہ سارے مستشرقین پر منفیت کا رنگ تھوپ دیا جائے اور بلا تفریق سب کو شک کی نظر سے دیکھا جائے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہم لوگوں کو بے لاگ انداز میں جانچیں۔ قرآن کا ارشاد ہے: ''...کسی گروہ کی دشمنی تمھیں کہیں عدل و انصاف سے دور نہ کر دے...''۔(۴۶) وہ غلطی کرنے والوں کے گناہ، بے گناہ لوگوں پر نہیں ڈالتا: ''...کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بار نہیں اٹھائے گا...''۔(۴۷)

مستشرقین، درحقیقت، باہمی طور پر متنوع اندازِ نظر کے مالک ہیں۔ انھیں یکساں نقطۂ نظر کی حامل یک آہنگ جماعت قرار دینا درست نہیں۔ ان میں سے کچھ نے معروضی اور بے لاگ انداز میں مطالعہ بروئے کار لانے کی کوشش کی، جبکہ دیگر تعصب اور بغض و عناد کے زیرِ اثر تھے۔ بعض نے اپنی

حکومتوں کے مقرر کردہ اہداف کو پیشِ نظر رکھا، دوسروں نے ان کی مخالفت کی۔ کچھ نے مشنری جذبے کے تحت کام کیا، دیگر 'پاپائیت مخالف' نقطۂ نظر کے مالک، لاادریّین اور وحیِ آسمانی کے منکر تھے۔ کچھ استعماری طاقت رکھنے والے ملکوں سے متعلق تھے، دیگر کا تعلق ایسے ممالک سے تھا جو سامراجی قوت کے مالک نہیں تھے۔ بعض قدآور علمی حیثیت کے حامل تھے، دوسرے درجۂ سوم کے مکتبی اور صحافی طرز کے لوگ تھے۔ ان مستشرقین میں Snouck Hurgronje نے استعماریوں کے مقاصد پورے کیے، جبکہ Ignaz Goldziher نے اس کے برعکس کسی حکومت کے ساتھ منسلک ہونے سے انکار کیا، اور مسلمانوں اور ان کی تہذیب کا بڑا مدّاح رہا۔ Edward Palmer نے برطانوی حکومت کے لیے بطور جاسوس کام کیا، جبکہ Wilfrid Blunt نے برطانیہ اور وادیِ نیل پر اس کے مقرر کردہ حاکم Lord Cromer کے خلاف مصریوں اور ان کے رہنما عُرابی کی حمایت کی(۴۸-۴۹)۔ کچھ مستشرقین اپنے مطالعۂ اسلام کے تحت مسلمان بھی ہوئے۔ فرانس کے Rene Guenon اور Vincent Mansour Monteil؛ سوئٹزر لینڈ کے Frithjof Schuon اور Titus (Ibrahim) Burckhardt ؛ ہنگری کا عبدالکریم Germanus؛ برطانیہ کا Martin Lings؛ اور امریکا کا Thomas Irving ان درجۂ اول کے مستشرقین میں سے ہیں جنھوں نے گہرے مطالعے کے بعد اسلام قبول کیا، اور اس کے لیے خدمات انجام دیں۔

یہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ بہت سے مستشرقین نے بڑا ستم ڈھایا اور مسلم مسیحی تعلقات میں بہتری پیدا کرنے کی بجائے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اپنی نہات حدّت کی حامل یا منفی تحریروں کے ذریعے تخریبی کردار ادا کیا۔ وہ باہمی فہم و افہام کے لیے راستہ صاف کرنے کی بجائے رکاوٹیں کھڑی کرنے میں مصروف رہے۔ بعض اوقات مسلمانوں اور مغرب کو قریب لانے کا تعمیری کردار مستشرقین کی بجائے، ان غیر متعصب محققین و مصنفین نے ادا کیا جو مستشرقین کے کام سے تنقیدی انداز میں فائدہ اٹھاتے ہوئے، آزادانہ اور معروضی طور پر ایسے نتائج تک پہنچے جو متخصصین کی جانبدارانہ تشریحات سے مختلف تھے۔ مثال کے طور پر Thomas Carlyle کا ''پیغمبرِ اسلامؐ بطور ہیروؔ'' کے موضوع پر 1840ء کا عوامی اجتماع میں کیا گیا وہ خطاب جسے اب بہت سراہا جاتا ہے، اور جس میں پہلی دفعہ برطانیہ کے ایک بڑے ادیب نے پیغمبرِ اسلامؐ کی مخلصانہ کوششوں اور عظمت کو تسلیم کیا۔(۵۰) اس خطاب نے (جو کسی طور اسلام کے سارے پہلوؤں پر کوئی جذبات آگیں مدحیہ قصیدہ نہیں) مستشرقین کے کام کی ضخیم جلدوں سے کہیں بڑھ کر مسلمانوں اور مغرب کے درمیان فہم و افہام کے مقصد کو آگے بڑھایا۔ اس سلسلے کی ایک تازہ مثال Karen Armstrong کی تصنیف کردہ پیغمبرِ

اسلامؐ کی سوانح حیات ہے۔ یہ ایک غیر متخصص، مگر صاف ذہن خاتون کی نہایت قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔(۵۱) اگرچہ مصنفہ نے کہیں کہیں ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جو مسلمانوں کے عقیدے سے پورے طور مطابقت نہیں رکھتے، مگر یہ کتاب پیغمبرِ اسلامؐ اور ان کے پیغام کی مثبت انداز میں تصویر کشی کرتے ہوئے اسے ان قارئین کے سامنے پیش کرتی ہے جو ماضی میں مسلم دشمن تحریروں سے فکری غذا حاصل کرتے رہے۔

اس مضمون کی محدود گنجائش کے پیشِ نظر کسی قدر سطحیت کا خطرہ مول لے کر ہم یہ کوشش ضرور کریں گے کہ مستشرقین کے اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کے بارے میں اختیار کردہ رویے کے پیچھے کارفرما اسباب کا مختصر طور پر جائزہ لیں۔ مستشرقین اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کے بارے میں اپنے مذہبی، تاریخی اور ثقافتی پسِ منظر کے تحت کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔ ان مغربی ماہرینِ 'اسلامیات' کی تحریروں کے بارے میں Norman Daniel نے یہ بات ملاحظہ کی ہے کہ: ''...جب ہم [مسلم تہذیب و ثقافت سے] مغائر سوچ فہم کے حامل اہلِ علم کو پڑھتے ہیں تو یہ بات ہمارے ذہن نشین ہونی چاہیے کہ 'قرونِ وسطیٰ' کی عیسائی دنیا کس طرح بحث و جدال کیا کرتی تھی۔ [یہ پیشِ نظر رکھنا اس لیے ضروری ہے] کہ آج تک وہ [نقطہ ہائے نظر اور تصورات] اس موضوع کا مطالعہ کرنے والے مغربی ذہن کی ساخت کا حصہ ہیں''۔(۵۲) یہ محض ایک عامل ہے جو اسلام کے بارے میں مستشرقین کے رویے کو ایک انتہائی سیکولر دور میں بھی متأثر کر رہا ہے۔ ہزار سالہ پرانے تعصّبات محض پرانے ہونے کی وجہ سے ختم نہیں ہو جاتے۔ کوئی یہ خیال کر سکتا ہے کہ 'روشن خیالی' اور 'تعقل پسندی' کے دور کا آفتاب طلوع ہونے پر مستشرقین نے اسلام کے بارے میں زیادہ متوازن نقطۂ نظر اختیار کر لیا ہو گا۔ یقیناً، چند ایک نے ایسا ضرور کیا، لیکن صورتِ حال اس قدر آسان اور سادہ نہ تھی۔ 'پاپائیت مخالف' نقطۂ نظر اور دیگر نئے نظریات اس دور میں کثرت سے ظاہر ہوئے، اور مذہب کے بارے میں روایتی تصورات کو فکر و دانش کی یہ انقلابی لہریں بلاتخصیص ایک رو میں بہا کر لے گئیں۔ ڈارونیت (Dawinism) کے اثرات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے اہلِ علم حضرات نے انھیں ایسے ادارے تصور کیا جو انسان کے ساختہ اور 'ناموسِ ارتقا' کی زد پر ہیں۔ یہ ''مسیحؑ کو اس کی تاریخی حیثیت میں تلاش کرنے'' ("the quest of historical Jesus") کے بنیادی عوامل میں سے ایک ہے، جو مسیحؑ کے گرد پھیلی سوانح عمریوں کی دھند کو ہٹانے کے لیے ضروری تھا(۵۳)۔ بلکہ بعض اہلِ مغرب نے مسیحؑ کے وجود پر ہی شک کا اظہار کیا۔(۵۴) اسی طرح بائیبل کی ''تنقیدِ اعلیٰ'' ("higher criticism" of Bible) کے تحت بھی عبرانی زبان اور 'کتابِ مقدس' کی اصل (origins) کے

بارے میں ارتقائی نقطۂ نظر سے مطالعے کا آغاز ہوا۔

یہ اندازِ نظر ان صحائف و کتب کے مطالعے کے لیے اس وجہ سے روا ٹھہرا کہ محققین کے پاس تواتر کے ساتھ ایک ٹھوس دستاویزی ثبوت موجود تھا جو انھوں نے عرصۂ دراز کی تحقیق و جستجو اور استقرائی مطالعے سے تشکیل دیا تھا، اور یہ دستاویزی ثبوت، درحقیقت، بہت سی تحریروں کا ایک مرکب مجموعہ تھا۔ لیکن مستشرقین نے دائرے کو مربعے کی شکل دینے کی کوشش کی، اور اسلام پر بھی اسی نقطۂ نظر کی تطبیق کرنا چاہی جسے وہ عیسائیت اور یہودیت کے مطالعے میں بروئے کار لاتے تھے۔ یہ بات ان کے اور مسلمانوں کے درمیان بحث و جدال اور آویزش کے بنیادی اختلافی نقاط میں سے ایک تھی۔ مماثلتوں کے باوجود، اسلام کی تاریخ، عیسائیت اور یہودیت کی تاریخ سے مختلف تھی، جس طرح قرآن کی اصل (origin) اور تاریخ، بائبل کی اصل و تاریخ سے مغائر تھی۔ اسی طرح پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی، انجام دادہ کام اور حاصل ہونے والی کامیابیاں، مسیحؑ کی حیات و آثار سے مختلف واقع ہوئی تھیں۔ قرآن کی جمع و ترتیب کو، مثال کے طور پر، تورات کی ترتیب و تدوین سے مشابہت نہیں دی جا سکتی(۵۵)۔ ایسا اگر کیا بھی جائے تو تاریخی، نیز تحقیقی لحاظ سے ایک غیر علمی بات ہو گی۔

مزید برآں، مستشرقین نے مختلف فرضیہ جات کے تحت یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے خدا کی وحدانیت کے قائل پہلے دو مذاہب سے باتیں مستعار لی ہیں، نیز قرآن ان مذاہب کے صحائف و کتب سے ماخوذ ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ تینوں مذاہب آسمانی ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا یقیناً مناسب نہ ہو گا کہ ان میں مشترک تعلیمات نہیں پائی جاتیں۔ اپنے حدِّ اعتدال سے بڑھے ہوئے جوش و جذبے کے تحت یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اسلام دراصل عیسائیت اور یہودیت کی تعلیمات کا ایک پراگندہ آمیزہ ہے(۵۶)، بعض مستشرقین نے صحت و صداقت کی حدود کو اس قدر پھیلایا کہ انھی کے کچھ دیگر ہمکاروں کو اسلام کی حمایت اور اس کی اصالت کے دفاع کا کام انجام دینا پڑا۔ یہ غیر علمی اور تعصب کے حامل نتائج اگر مضرت رساں نہ ہوتے تو ان سے لطف اندوز ضرور ہوا جا سکتا تھا۔ کچھ مستشرقین نے الزام لگایا کہ اسلام نے عیسائیت کی باتیں مستعار لی ہیں، دیگر نے اس نقطۂ نظر کی مخالفت کی اور کہا کہ اسلام، یہودیت کی مسخ شدہ شکل ہے۔ تاہم، کچھ دوسرے اس بات کے قائل تھے کہ اسلام ''سامریت'' (Samaritanism) سے تشکیل دیا گیا مذہب ہے(۵۷-۵۸)۔ اس طرح وہ اپنے فرضیہ جات بناتے اور رد کرتے رہے، بعینہٖ Bath کی بیوی(۵۹) کے مانند جس نے پانچ شوہر بدلے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کچھ مستشرقین اسلام کے بارے میں واقعی پریشانی کا شکار رہے کہ وہ ان کے علم میں آنے والے دوسرے کسی بھی مذہب سے مختلف واقع ہوا تھا۔

یہ بات کہ 'مستشرقین نے پیغمبرِ اسلامؐ ایسا کوئی نبی نہیں پایا'، اس خاص مشکل کا پتا دیتی ہے جس سے انھیں پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی اور ان کی حاصل کردہ روحانی و دنیوی کامیابیوں کو پرکھنے کے سلسلے میں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تاہم، پیغمبرؐ کے بارے میں ان کی اپنی منفرد حیثیت کے اعتبار سے مطالعہ بروئے کار لانے کی بجائے وہ انھیں مذہبی شخصیت کے بارے میں قائم کردہ اپنے اس تصور کی روشنی پرکھتے ہیں جس کی نمائندگی کسی معروف ترین مذہبی شخصیت، یعنی یسوع مسیحؑ نے کی۔ وہ مخلص عیسائی محققین ہوں یا سیکولر اندازِ فکر کے حامل، ان کے نزدیک شعوری یا نیم شعوری طور پر تصور کردہ مثالی مذہبی شخصیت مسیحؑ کی شکل ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ بسا اوقات پیغمبرِ اسلامؐ کا یسوع مسیحؑ کے ساتھ تقابل کرتے ہیں، جو تحقیق کے طریقۂ کار، نیز تاریخی لحاظ سے ایک نادرست بات ہے۔ یہ دو عظیم پیغمبرانِ خدا باہم مختلف شخصیت کے مالک اور مختلف ماحول کے پروردہ، ایک دوسرے سے مختلف فریضے کی ادائیگی کے لیے مبعوث ہوئے۔ لیکن مستشرقین استدلال کا یہ انداز اپناتے ہیں کہ یسوعؑ کبھی رشتۂ ازدواج میں منسلک نہیں ہوئے، جبکہ محمدؐ نے ایک سے زائد بار شادی کی۔ اس لیے مؤخر الذکر شہوانیت کے دل دادہ تھے۔ مسیحؑ نے ریاست و حکومت کی بنیاد نہیں رکھی، جبکہ محمدؐ نے ایسا کیا۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ محمدؐ طاقت کے گرسنہ، میکیاولی (Machiavellian) انداز کے حکمران تھے۔ مسیحؑ نے جنگ نہیں لڑی، جبکہ محمدؐ نے ایک سے زیادہ جنگوں میں حصہ لیا۔ لہٰذا، وہ یقینی طور پر خون آشام جنگجو تھے۔ یسوعؑ کو اپنے دنیاوی اعداء پر کامیاب حاصل نہیں ہوئی، جبکہ محمدؐ نے اپنے دشمنوں پر فتح پائی۔ چنانچہ وہ کسی قسم کے اخلاقی اصول سے بے گانہ ایک حیلہ باز شخص تھے۔(۶۰) المختصر، ان مستشرقین کا خیال ہے کہ محمدؐ چونکہ بہت سے پہلوؤں سے مسیحؑ سے مختلف ہیں، لہٰذا یہ فطری بات ہوئی کہ وہ ایک مذہبی رہنما کے لیے درکار خصوصیات سے عاری ہیں۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے کردار پر مستشرقین کے اضطراب پرور حملے اور لاگو کردہ طعن آمیز فیصلے، مسلمانوں اور مغرب کے درمیان احساسِ ناگواری اور نزاع و مخاصمت کا بنیادی سبب ہیں۔ مغرب کی پیغمبرِ اسلامؐ سے (جن پر ہر مسلمان اپنی پنجگانہ نمازوں میں عقیدت کے ساتھ دعائے رحمت بھیجتا ہیں) طبعی نفرت کی بنیادیں کافی پرانی ہیں۔

اہلِ مغرب کے اس حملے کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کو قدح و طعن کا ہدف بنانے والے محض پرجوش پادری یا 'قرونِ وسطیٰ' کے وہ جاہل اوباش افراد نہ تھے، جو صلیبی جنگوں کی آگ بھڑکانے کے لیے لوگوں کو بے سروپا قصوں سے اکسایا کرتے تھے، بلکہ ان میں 'مابعدِ عہدِ روشن' کے مصنفین، حتیٰ کہ نہایت ذی علم مستشرقین بھی شامل تھے۔ موجودہ دور تک تقریباً

یہ سبھی اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری رہے کہ محمدؐ کو بطور پیغمبر مبعوث کیا گیا؛ جس کا مطلب یہ ہوا کہ محمدؐ نبوت کے جھوٹے مدعی اور حیلہ و فریب کی دکان سجانے والے ایک شعبدہ باز تھے۔ اس طرح کے مستشرقین اسلام کو سمجھنے سے عاری رہے، بدیں وجہ کہ ان کے اور اسلام کے درمیان تعصب کا پردہ حائل ہے۔ نیز وہ اس بات سے قطعاً ناواقف ہیں کہ ایک ارب مسلمان اپنے پیغمبر سے انتہائی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں۔(۶۱)

پچھلے چند عشروں کے دوران بعض معروف مستشرقین نے یہ محسوس کیا کہ ان کے بہت سے ہمکار پیغمبرِ اسلامؐ کے بارے میں اپنے رویے اور قائم کردہ رائے میں کسی قدر ناانصافی کے مرتکب ہوئے ہیں، اور تعصب، نیز غیر علمی رویے کا مظاہرہ کیا ہے۔ کچھ نے متردد ہو کر، اور دیگر نے باوقار انداز میں پیغمبرِ اسلامؐ کی نبوت کا اعتراف کیا۔ ان کا یہ اعتراف بارش کے پہلے قطرے کا کردار ادا کر سکتا ہے، خاص طور پر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مستشرقین جس بات کی طرف رہنمائی کریں، ان کے معاشرے، نیز پادری حضرات بھی اس کی پیروی کرتے ہیں۔ دوسری طرف پیغمبر محمدؐ کی بعثت و نبوت کا تسلیم کیا جانا مسلمانوں کے نزدیک اس بات کی کسوٹی ہو گا کہ آیا دوسرے مذاہب بھی پیغمبرِ اسلامؐ اور مسلمانوں کے بارے میں احترام کا مظاہرہ کرتے ہیں!

مستشرقین کا امن و ہم آہنگی کی شاہراہ پر سفر خاصا طویل رہا۔ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا جب Carlyle نے Edinburgh میں پیغمبر محمدؐ کی نبوت کا بلند آہنگ لہجے اور واشگاف الفاظ میں عوامی اجتماع کے اندر اعتراف کیا۔ پہلے اس نوعیت کا کبھی کبھار کیا جانے ولا اعتراف اب اکثر سننے پڑھنے میں آتا ہیں۔ مستشرقین کے اس نوعیت کے بیانات مسلمانوں اور مغرب کے درمیان پائی جانے والی پرانی غلط فہمیاں دور کرنے اور باہمی رابطہ استوار کرنے میں نہایت تعمیری کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہاں میں اس غرض سے چوٹی کے دو مستشرقین کے ہاں سے چند جملے اقتباس کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ Robert Zaehner کا کہنا ہے: ''میرے لیے اس بات کے پیشِ نظر کہ محمدؐ واقعی پیغمبر تھے، اور نبوت کی قابلِ اعتماد آواز نے محمدؐ کے ذریعے لوگوں تک رسائی حاصل کی، یہ ماننا ممکن نہیں کہ کوئی معقول بنیادوں پر اس نبوت کو تسلیم کرنے سے انکار کرے۔.''(۶۲)۔ William Montgomery Watt لکھتا ہے: ''میں سمجھتا ہوں کہ محمدؐ ایک سچے پیغمبر تھے، اور عیسائیت کے اس اصول کے تحت کہ 'تم انھیں ان کے ثمرات سے پہچانو گے'، میرا یہ خیال ہے کہ ہم عیسائیوں کو محمدؐ کی نبوت تسلیم کر لینی چاہیے، بالخصوص جب یہ واضح ہو چکا کہ اپنی تاریخ کی بہت سی صدیوں کے دوران اسلام نے کئی سربرآوردہ اور برگزیدہ لوگ پیدا کیے۔ یوں محمدؐ اگر پیغمبر شمار ہوتے

ہیں، تو عیسائی اعتقاد ہی کے مطابق کہ 'روح القدس' پیغمبروں کے ذریعے مخاطب ہوتی ہے، قرآن کی الہامی حیثیت کو تسلیم کیا جا سکتا ہے''۔(۶۳)

۷۔ مسلم مسیحی تعلقات میں تازہ پیش رفت

عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ بات چیت اور بہتر تعلقات کے اصول قرآن میں بیان کیے گئے ہیں، جو 'اہلِ کتاب' کو مستقل اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ 'ایک خدا کی عبادت' کے لحاظ سے وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر یکساں ہدف اپنائیں۔(۶۴) یہ خود قرآن کی تعلیمات کا اثر تھا کہ مسلمانوں کے ہاں 'اہلِ کتاب' کے سلسلے میں تاریخی طور پر رواداری کا رویہ پروان چڑھا، اور مسلمان بائبل میں مذکور پیغمبروں کا احترام کرتے ہیں۔

دوسری طرف عیسائیوں کے ہاں کچھ اہلِ علم کا موجودہ دور میں پیغمبر محمدؐ کی نبوت کو تسلیم کرنا، مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان بہتر فہم و افہام اور ہم آہنگی کی خوشتر فضا پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے، جو صدیوں سے انتہائی مکدر رہی ہے۔ بعض مستشرقین، جو اپنے اعتقاد میں پختہ اور مخلص ہوتے ہوئے اسلام کے کچھ پہلوؤں (جیسے 'تصورِ تقویٰ') سے متأثر ہوئے، نے عیسائیوں کے تسلیم شدہ کنیسہ جات کی طرف سے مسلمانوں کے بارے میں اپنائے گئے رویے میں رسمی، مگر دور رس اثرات کی حامل تبدیلی کے لیے راہ ہموار کی۔ کئی مستشرقین، جیسے Louis Massignon، Miguel Asin y Palacios اور Jacques Jomier کی ترجمان وضاحتی تحریروں نے اس طرح کی تبدیلی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا، اور 1965ء میں Second Vatican Council نے اپنی نوعیت کا ایک منفرد، خوش آئند اعلامیہ جاری کیا، جو Nostra Aetate کے نام سے معروف ہے(۶۵)، اور جسے مسلم مسیحی تعلقات میں واقعتاً ایک اہم موڑ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس اعلامیے میں بالآخر عیسائیوں نے رسمی طور پر مسلمانوں کو بطور ایک مذہبی گروہ کے تسلیم کیا، اور ان کے لیے احترام کا اظہار کیا۔(۶۶) ان اہلِ علم حضرات کا بے حد شکریہ کہ 'رومن کیتھولک چرچ' نے پہلی دفعہ ایک ایسا نظریہ وضع کیا جس کے تحت مسلمانوں کا 'نجاتِ خداوندی' کے منصوبے میں شامل 'اہلِ ایمان' کے طور پر اعتراف کیا گیا۔ بدیں وجہ کہ مسلمان ''خالق کو مانتے ہیں''، اور ''پیغمبر ابراہیمؑ کے اعتقاد کا حامل ہونے کا اعلان کرتے ہیں، نیز ہمارے [عیسائیوں] کے ساتھ ایک واحد، رحم کرنے والے خدا کی عبادت کرتے ہیں، جو روزِ آخرت انسانوں کے لیے فیصلہ کرنے والا ہے''۔(۶۷)

آنے والے دنوں میں جب یہ سرکاری اعتراف، عام عیسائی افراد اور چرچ کے عہدیداران کی

زیادہ بڑی تعداد کے ہاں جھلکتا نظر آئے گا، تو فہم و افہام اور ہم آہنگی کے دروازے پوری طرح کھل جائیں گے۔ مسلمان اس پیش رفت کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔

Vatican کے اس Nostra Aetate اعلامیے پر عمل درآمد بھی دیکھنے میں آیا۔(۶۸) اس سلسلے کے ابتدائی مثبت اقدامات میں سے ایک یہ تھا کہ چرچ کے زیرِ نگرانی چلنے والے اسکولوں کے تدریسی نصاب سے مسلم دشمن حوالہ جات حذف کیے گئے۔ ایک دوسرا اقدام باہمی بات چیت کے لیے ایک ادارے کا قیام تھا، جو بعد ازاں Pontifical Council for Interreligious Dialogue کے نام سے سامنے آیا۔ کنیسہ جات کی رہنمائی میں مذہب پر کاربند عیسائیوں اور چرچ کے ذی علم نمائندگان نے بہت سی کتب تصنیف کیں، جن میں اسلام اور اس کی تعلیمات کو بیان کیا گیا، اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی کے بارے میں بتایا گیا۔ اس طرح کی تصنیفات برداشت، معروضی اندازِ نظر اور حساس باتوں کو [مناسب طور پر] بیان کرنے کی بہترین مثال پیش کرتی ہیں۔ ان کی کتابیات میں مسلم مصادر و مراجع کے حوالہ جات بھی شامل ہیں۔ مصنفین نے مناظرہ جاتی انداز کو رد کرتے ہوئے مسلم مسیحی تعلقات میں مثبت عناصر کو اجاگر کرنے پر توجہ دی ہے۔

۸۔ آئندہ کے امکانات اور درپیش مسائل

یہ تبدیلیاں دوررس اثرات کی حامل ہیں۔ تاہم، مشکلات تا حال درپیش ہیں، اور آئندہ بھی رہیں گی۔ مسلمانوں کو اپنے لحاظ سے کچھ خاص میدانوں میں اور زیادہ پیش رفت کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں اور مسلم علاقوں میں رہنے والے اقلیتی عیسائی گروہوں کے درمیان تعلقات بڑے عرصے سے تناؤ کا شکار ہیں۔ حالانکہ ان کا تحفظ مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے، (اور انھیں چودہ سو سال تک مسلمانوں کی جانب سے تحفظ حاصل بھی رہا)۔ اس تناؤ کی جڑیں مذہب سے زیادہ معاشی مسائل میں پیوست ہیں۔ ان اقلیتوں کے کچھ حصوں کے خلاف مسلمانوں کی وقتی طور پر پائی جانے والی جائز شکایات کے باوجود، اسلام کے تلقین کردہ عدل و انصاف کے عالمگیر اصول کی بنیاد پر مسلمان یہ موقف اپنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ وہ ان کے بارے میں وسیع القلبی کا مظاہرہ کریں۔ مسلمان، بہرحال، ان ممالک میں زیادہ طاقت ور حیثیت کے مالک ہیں، اور اس بنا پر وسعتِ قلب و نظر کا حامل رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔

Vatican کے امن و ہم آہنگی پر مبنی موقف نے Presbyterians اور World Council of Churches جیسے دیگر مسیحی گروہوں اور تنظیموں کو مسلمانوں کے ساتھ ہم آہنگی اور تعاون کے

اعلامیے جاری کرنے اور بین المذاہب تعلقات میں بہتری لانے کے لیے ٹھوس اقدامات اٹھانے پر آمادہ کیا۔ اس سلسلے میں جلد ہی مسلم مسیحی مکالمے کی سمت قدم بڑھایا گیا، جس میں Vatican، Middle East Council of Churches اور World Council of Churches، نیز مسلمانوں کی جانب سے World Muslim League اور World Muslim Congress سمیت طرفین کی سینکڑوں تنظیموں نے مقامی، علاقائی اور قومی و بین الاقوامی سطح پر حصہ لیا۔

اس مکالمے نے کئی راستے اپنائے، جن میں مذہبی الٰہیاتی نوعیت کی بات چیت، مختلف گروہوں کی باہمی خیر سگالی گفت و شنید اور سیاسی مکالمے کی راہ شامل ہیں۔(۶۹) مذہبی سطح پر ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ کچھ ایسے ناقابلِ اتفاق الٰہیاتی مسائل پائے جاتے ہیں جنھیں ہمارے 'وحدانیت' کے نظریے پر مبنی مشترک مذہبی اعتقادات اور اخلاقی اہداف کے حصول کے لیے باہمی تعاون میں بہرطور رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ بلکہ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ ہمارے مابین بنیادی نوعیت کے اختلافات پائے جاتے ہیں، ہمیں ایک دوسرے کے ہاں معروف و معمول مثبت اقدار کا ادراک اور لحاظ کرنا چاہیے، اور خلقِ خدا کی فلاح کے لیے ہمکارانہ طور پر کام انجام دینے کو آگے بڑھنا چاہیے۔

عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ اور تلخی کے حامل تعلقات کی کئی صدیوں کے بعد، بلا شبہ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ دونوں اطراف میں شکوک ابھی تک موجود ہیں۔ کچھ عیسائی گفت و شنید کو اپنے مشنری کام کے لیے خطرہ تصور کرتے ہیں، اور اسلام کو ابھی تک اپنے مذہب کا دشمن سمجھتے ہیں۔ اس کے مقابل، کچھ مسلمان بھی بات چیت کو عیسائی مشنری مقاصد کا نیا فریب دہ روپ خیال کرتے ہیں۔ جبکہ بعض مسلمانوں کا یہ نظریہ ہے کہ مغربی طاقتوں کی پیدا کردہ سیاسی عداوت کے ماحول میں مکالمے کو بروئے کار لانا ایک مشکل امر ہے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں، ہر دو کے لیے ضروری ہے کہ مسلم مسیحی آویزش میں ان انجیلی بنیاد پرستوں کی نشان دہی کریں جو بدقسمتی سے اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پروان چڑھاتے ہیں۔ ہمیں بہرصورت اس مکالمے کے مثبت اور افادی پہلوؤں پر توجہ صرف کرنا ہو گی، اور اسے محض الٰہیاتی بحثوں کے لحاظ سے نہیں دیکھنا ہو گا۔ گفت و شنید، صرف الٰہیاتی یا مذہبی دائرہ ہائے کار تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ وہ معاشرتی مسائل اور خدا کے عائد کردہ فرائض (service of God) کو کئی ذریعوں سے بروئے کار لانے کی بات بھی بحث میں شامل کرتی ہے۔ سماجی اور سیاسی انصاف کے مقصد کی حمایت کرنا؛ سارے گروہوں کے نادار اور مصائب کے شکار لوگوں کی مدد کے لیے فلاح و خیر کی سرگرمیوں میں حصہ لینا؛ نیز ماحول کے تحفظ اور جانوروں سے نرمی کے سلوک کو فروغ دینا اسی ذیل میں آتا ہے۔

یہ کسی قدر تسلیم شدہ بات ہے کہ مذہبی زاویۂ نظر رکھنے والے لوگ، مذہبی سوچ کے حامل دوسرے لوگوں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور ان کے مسائل کا ادراک کرنے کی بہتر صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں؛ جس سے بات چیت اور ہمکاری زیادہ آسان ہو جاتی ہے۔ مذہبی اعتقاد کے حامل لوگوں کے باہم مشترک معاملات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلم مسیحی تعاون کا میدان، ان کے 'تخیل کی رسائی' کی طرح، بہت وسیع اور زرخیز ہے، جس میں فکری، سائنسی، اقتصادی، فلاحی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی، تقریباً سبھی شعبہ جات میں بروئے کار آ سکنے والے منصوبہ جات شامل ہیں۔ مغرب میں کئی سطحوں پر، خاص طور پر مقامی لحاظ سے بہت سے سماجی اور گروہی منصوبے یا منصوبہ کار ادارے موجود رہے ہیں، جن کے توسط سے مسلمانوں اور عیسائیوں نے باہم تعاون کا مظاہرہ کیا۔ لیکن مسلم دنیا اور مغرب کے درمیان بڑے پیمانے پر اس نوعیت کے ہمکار منصوبہ جات کا فقدان رہا ہے۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مسلمانوں اور مغرب کے درمیان عسکری حکمتِ عملی اور حرب و قتال کے شعبوں سے ہٹ کر، کسی میدان میں ہمکاری کے بارے میں تقریباً نہ ہونے کے برابر تحریری اور دستاویزی مواد دستیاب ہوتا ہے۔ میں یہاں امکانات کی نشان دہی کرنے کے لیے، مسلم مسیحی تعاون کے سلسلے میں اس وقت ہونے والی کوششوں کی ایک دو مثالیں آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔ نیز دوتین ایسے میدان ہائے کار کا ذکر بھی کروں گا جن سے یہ واضح ہو گا کہ اس طرح کے ہمکار منصوبے کس قدر مفید اور متنوع پہلوؤں کے حامل ہیں۔

مغرب میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان فہم و افہام کو فروغ دینے کے لیے کچھ مراکز قائم کیے گئے ہیں، جن میں Connecticut (ریاست ہائے متحدۂ امریکا) میں Hartford Seminary کا Macdonald Centre for Islam and Christian-Muslim Relations؛ برمنگھم (برطانیہ) میں Selly Oak Colleges کا Centre for the Study of Islam and Christian-Muslim Relations؛ اور واشنگٹن ڈی سی میں Georgetown University کا Centre for Muslim- Christian Understanding شامل ہیں۔ بعض صورتوں میں مشنری اور پادری حضرات نے ان اداروں کے قیام میں خاصا کردار ادا کیا، تاہم ان میں کام کرنے والے اسٹاف کے کچھ ارکان ابھی تک محض انجیل کی تعلیمات کو پھیلانے اور اپنے تئیں اسلام کے پیغام کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ مراکز اس حقیقت کے بارے میں زیادہ حساس ہوتے جا رہے ہیں کہ اسلام ایک سچا مذہب ہے۔(۷۰) مزید برآں، وہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی

نمائندگی کرنے والے مستقل یا زائر مسلم اسکالروں کو بھی اپنے ہاں بار پانے دیتے ہیں۔(۷۱) ہم مسلمانوں کو بھی اپنے ممالک میں اس نوعیت کے ادارے قائم کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ مغربی اور عالمی تہذیب میں ہم عیسائیت کے گزشتہ و آئندہ حصے کا معروضی طور پر مطالعہ کر سکیں۔ مسلمان اور عیسائی اسکالروں کے درمیان اس طرح کی پر سکون تعلیمی فضا میں باہم ملنا جلنا اور کام کرنا 'وحدانیت' کے قائل ان دو مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان تعلقات میں بہتری لانے کا موجب ہو گا۔

باہمی تعاون میں امکانات کا حامل اسی طرح کا ایک اور نظر انداز کیا گیا شعبہ ہے۔ عیسائیت اور اسلام، دونوں انسان کے مصائب و آلام میں کمی لانے کو بہت زیادہ اخلاقی اہمیت دیتے ہیں۔ جدید تحقیقات اور ترقی یافتہ ٹیکنالوجی، نئی دواؤں کی دریافت اور تیاری کے سلسلے میں تازہ افق روشن کر رہی ہیں۔ آج ایک دوا ساز، علاج کی غرض سے بروئے کار لائے جانے والے کسی تجربے کے لیے ایک ہفتے میں دس ہزار سالموں (molecules) کا تجزیہ کر سکتا ہے، جبکہ ماضی میں اسے ایک سالمے کا جائزہ لینے کو ایک ماہ کا وقت درکار ہوتا تھا۔(۷۲) البتہ، اب بھی یہ کام خاصا دشوار اور مہنگا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نئی دواؤں کی دریافت میں کامیابی کا تناسب کافی حوصلہ شکن ہے۔ تجزیہ کردہ سات لاکھ مرکبات میں سے صرف ایک ہزار فائدے کے حامل نظر آتے ہیں، اور ان ہزار میں بھی صرف بارہ مرکبات واقعی دوا بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جبکہ آخری مرحلے میں محض ایک مرکب دواسازی میں کام آتا ہے۔(۷۳) دواسازی کے اس عمل پر آنے والی لاگت کی وجہ سے ایسی دوائیں جن کی اگرچہ بہت کم لوگوں کو، مگر اشد ضرورت ہوتی ہے، اور جن کی اصل قیمت بھی واپس نہیں ملتی، انھیں تجارتی دوا ساز کمپنیاں عام طور پر تیار نہیں کرتیں۔ دواسازی کے میدان میں مسلمانوں کا بھر پور تاریخی ورثہ، مالی ذرائع اور ان کی پیشہ ورانہ صلاحیت، جبکہ مغرب کی اعلیٰ تکنیکی اہلیت اور تخصص کی حامل تحقیقی مہارت، نیز تحقیق میں ان کا مخلصانہ انداز؛ یہ سب چیزیں مل کر طبی ادویات کی تیاری میں شراکت و تعاون کے عمل کو آگے بڑھانے میں مدد دے سکتی ہیں، تاکہ انسانوں، جانوروں اور پودوں میں شاذ و نادر اور عام طور پر پائی جانے والی، ہر دو قسم کی بیماریوں کا علاج ممکن ہو سکے۔

اسلامی بنکاری، مسلمانوں اور مغرب کے درمیان تعاون کا ایک تیسرا میدان ہے، جس نے حال ہی میں آغاز کیا، اور آنے والے سالوں میں اس کے پروان چڑھنے اور پھلنے پھولنے کے امکانات ہیں۔(۷۴) یہ ان بے شمار مسلمانوں کے لیے ایک انتہائی اہمیت اور حساسیت کی حامل سرگرمی ہے جو سود پر چلنے والے اقتصادی معاملات میں حصہ لینا پسند نہیں کرتے۔ روایتی انداز کے بہت سے ایسے بنک پہلے سے موجود ہیں جو اسلامی اصولوں کے تحت اقتصادی معاملات چلاتے اور مالی خدمات مہیا کرتے

ہیں؛ جس سے واضح ہوتا ہے کہ اپنے معاشی معاملات اپنے مذہبی اعتقادات کے مطابق چلانے کے خواہشمند اہلِ مغرب اور مسلمانوں کے درمیان کاروباری تعلقات ممکن بھی ہیں اور نفع بخش بھی۔ یہاں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مذہبی پسِ منظر رکھنے والے عیسائی، مسلمانوں کی ضروریات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ مغرب میں عیسائی، نیز وہ لوگ بھی جو رسمی طور پر عیسائیت سے منسلک نہیں، یہی راستہ اختیار کرتے ہیں۔ مختلف تجارتی کمپنیوں اور منصوبوں میں سرمایہ لگانے والے، اخلاقی اصولوں پر کاربند عیسائی اور مسلمان اب اپنا پیسہ ان سماجی طور پر ذمہ دار مالیاتی تنظیموں کے سپرد کرتے ہیں جو اخلاقی ضابطوں کی پاسداری کریں۔(۷۵) یہ مالیاتی تنظیمیں سود پر چلنے والے اقتصادی اداروں؛ امتیازی سلوک کرنے والی کمپنیوں؛ الکحل، اسلحہ، تمباکو اور اسقاطِ حمل کی ادویہ و آلات کی پیداوار یا فروغ دینے، نیز قماربازی، تشدد اور اخلاق باختہ فلمیں بنانے والی اور نقصان دہ ماحولیاتی سرگرمیوں میں ملوث کمپنیوں میں سرمایہ نہیں لگاتیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر کی حامل بہت سی مالیاتی تنظیمیں ان کمپنیوں کی درجہ بندی، جن میں وہ سرمایہ لگاتی ہیں، ان کے مذہبی اصولوں پر کاربند ہونے کے لحاظ سے کرتی ہیں۔

اسلام اور عیسائیت کی اخلاقی اقدار، سرمایہ کاری (investment) کے شعبے میں باہم یکجا ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مالی ذرائع کی مشترکہ طاقت، تجارتی کمپنیوں اور ان کی پالیسیوں پر بہت کچھ اثر انداز ہو کر ان سماج دشمن اور جمعیت مخالف کاروباری معاملات کا مقابلہ کر سکتی ہیں جن میں حرص، مفادِ عامہ پر کاروباری لحاظ سے غلبہ پائے ہوئے نظر آتا ہے۔

اس مقالے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ مشرق و مغرب، نیز شمال و جنوب باہم مل سکتے ہیں، اور ان میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ مابعدالطبیعیاتی انگریز شاعر [جان ڈن] کے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'کوئی بھی قوم سمندر میں گھرا ایک الگ تھلگ جزیرہ نہیں ہوتی'۔ مسلمان اور عیسائی، نیز دیگر اعتقادات کے حامل لوگ انسانیت کے فائدے کی خاطر پرامن طور پر ہم کارانہ انداز میں جی سکتے ہیں، اور ہم سب اس کثیر العناصر، کثیر المذاہب دنیا میں رواداری کے ساتھ مناسب رویہ اپناتے ہوئے حالات میں بہتری پیدا کر سکتے ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے: ''اے انسانو! ہم نے تمھیں مرد اور عورت سے پیدا کیا، اور تمھیں قوموں اور قبائل [نسلوں] میں تقسیم کیا، تاکہ تم آپس میں شناسائی پیدا کرو [اور یوں باہمی طور پر اپنے معاملات چلاؤ اور فائدہ اُٹھا سکو]۔ [یاد رکھو] خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شرف و عزت کا حامل وہ ہے جو تم میں [اپنے معاملات و فوائد میں] سب سے زیادہ 'خدا شناس' [یعنی اپنے اور دوسروں کے لیے انسانی اور فطری دنیا میں قوانینِ خداوندی سے آگاہی] کا مظاہرہ کرنے والا ہے''۔(۷۶) خدا نے اپنی حکمتِ عملی کے تحت بالبداہت یہی چاہا کہ دنیا نہ صرف مختلف اقوام سے

آباد ہو، بلکہ لوگ مختلف مذاہب [و نظریات] کے بھی مالک ہوں۔ قرآن کا کہنا ہے: ’’اگر خدا کی مرضی ہوتی تو وہ تمھیں ایک قوم (امت) بنا دیتا...‘‘۔(۷۷) ایک ایسے دور میں جو الہامی ہدایت کو گمراہی اور کجی یا اس سے بھی بدتر تصور کرتا ہو، مسلمانوں اور عیسائیوں پر اخلاقی اور افادی لحاظ سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ باہم مل کر کام کریں۔ انھیں خدا کے عائد کردہ فرض اور انسانیت کی خدمت کا کام انجام دینے کی خاطر ایسی دنیا میں باہم مل کر چلنا ہے جس میں روزمرہ زندگی کی نمایاں خصوصیات میں سیکولرازم، ’مادیت‘، سماجی و سیاسی ناانصافی، جسمانی و اخلاقی امراض، مسلح آویزشیں، نیز فکری ثقافتی اور تجارتی آمدورفت کی عالمگیریت شامل ہیں۔ یہ مشکلات مغرب اور مسلمانوں کے درمیان تعاون کے بے شمار میدانوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے: ’’بلاشبہ انسان خسارے کا شکار ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان کے حامل ہیں، اور اچھے اعمال [وافعال] کا مظاہرہ کرتے ہیں، نیز باہم [سچ اور] حق بات کی تلقین، اور ایک دوسرے کو [ظلم کے مقابل اپنے درست موقف پر] ثابت قدم رہنے کی نصیحت کرتے ہیں‘‘۔(۷۸)

حواشی

(۱) حاشیہ از مترجم: اقبال پہلے قومیت پرست تھے۔ ان کی ابتدائی نظموں سے اسی بات کا ثبوت ملتا ہے: (اے ہمالہ، اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں :: چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں) اور (سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا......الخ)۔ لیکن قیامِ یورپ کے دوران اقبال نے جب کچھ عرصہ Pan-Islamism کی تحریک میں حصہ لیا، نیز نیشنلزم کی تباہ کاریوں اور دوسرے کا حق تسلیم نہ کرنے کی ہٹ دھرم بے اصول سیاست (جو طُرفہ بات ہے، خواہ سیکولر سہی مگر اصولوں پر قائم تھی) کے کریہہ چہرے کو قریب سے دیکھا، تو اس نوعیت کی قومیت پرستی اور ’بے اصول مادی‘ سیاست کے خلاف فکری اور اور عملی لحاظ سے سرگرم حصہ لینے لگے۔ (مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں :: کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر)۔ (تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام :: سینہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر)۔ پھر ’وطنیت‘ کے عنوان سے اقبال نے ’نیشنلزم‘ کے خلاف اپنی مؤثر ترین نظم لکھی۔ (اقوام جہاں میں ہے رقابت، تو اسی سے :: خالی ہے صداقت سے سیاست، تو اسی سے // مقصود ہے تسخیرِ تجارت، تو اسی سے :: کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت، تو اسی سے // اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے :: قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے)۔ اسی طرح Muslim Community کے نام سے اقبال نے ایک تفصیلی مضمون بھی قلمبند کیا۔ جبکہ عملی لحاظ سے اقبال نے سیاسی رہنماؤں سے ربط ضبط اور بعض کی حمایت اور انھیں آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ خود بھی سیاست میں حصہ لیا (جس کی روداد یکجا صورت میں رفیع الدین ہاشمی کی کتاب ’’اقبال: ایوانِ اسمبلی میں‘‘ میں دیکھی جا سکتی ہے)۔ جہاں تک مسلم قومیت کا تعلق ہے، اقبال اور کانگریس کے ہمنوا علماء کے درمیان اس سلسلے میں تلخی کا سماں بھی پیدا ہوا، اور اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار آج تک موضوعِ بحث بنتے آئے ہیں، جن میں نام نہاد عقیدت کی بجائے اقبال نے شعر اور اصطلاح کے پیرائے میں (جسے لفظیت پر محمول کرنا درست نہ ہوگا) پیغمبرؐ کے حقیقی مقام اور اصل پیغام کی طرف اشارہ کیا ہے: (عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ :: زدیوبند حسین احمد ایں

چہ بوالعجبی ست // سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است :: چہ بے خبر زمقامِ محمدِ عربی ست // بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست :: اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست)۔ ان اشعار میں اقبال نے پہلی بار کسی کا نام لے کر یوں تلخ جواب دیا تھا...... اقبال کی جانب سے بعد میں یہ اشعار تیاگنے (disown کرنے) کی ایک روداد بھی بیان کی جاتی ہے۔ رسالہ 'میثاق' میں کچھ خطوط کے حوالے سے جنابِ یوسف سلیم چشتی کے تحریر کردہ ایک مضمون میں علمائے دیوبند کے نظریے میں تبدیلی اور اقبال کی معذرت کا ذکر ہے۔ تاہم، غلام احمد پرویز نے اپنے رسالے 'طلوعِ اسلام' میں بعض دیگر تاریخی حوالوں سے اقبال کی جانب سے ان اشعار کو disown نہ کرنے اور علمائے دیوبند کا موقف برقرار رہنے کی تفصیل بیان کی گئی ہے...... بہرکیف، اقبال نے مسلم قومیت کو وطن کی بنیاد پر قائم کرنے کو 'بولہبی' کا نام دیتے ہوئے اپنا 'دو قومی نظریۂ' پیش کیا۔ اس کی عملی تعبیر پاکستان اور بھارت کی تقسیم کی صورت میں سامنے آئی۔ اس طرح پاکستان، اسرائیل کی طرح، ایک 'نظریاتی' ریاست ہے۔ لیکن نسلی اور لسانی بنیادوں پر استوار نہ ہونے کے لحاظ سے یہ اسرائیل سے مختلف انداز کا ملک ہے۔ البتہ قوم کا لفظ، جو علاقائی قومیتوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، 'دوقومی نظریۂ' کی واقعی تفہیم میں رکاوٹ بنا، جس میں قبل ازیں کانگریس کے ہمنوا علماء نے بھی، بقولِ اقبال 'لغت کے بکھیڑوں' میں الجھا کر حصہ لیا تھا۔ انھی علاقائی، نسلی اور لسانی جتھے بندیوں اور خالص گروہی تعصب نے جغرافیائی دوری کو بہانہ بناتے ہوئے مشرقی پاکستان کو 'بنگلا دیش' کی صورت میں واقعی علیٰحدہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا، اور بھارت نے دو قومی نظریے کے بحرِ ہند میں ڈوبنے کی بات کی۔ اب بھی پاکستان کی علاقائی قومیتیں، جو نسل اور زبان کی بنیادوں پر استوار ہوں یا مخصوص 'مذہبی فقہی' اساس پر، اصل 'دوقومی نظریۂ' کو ڈبونے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ پہلے انھیں بیرونی آشیرباد بھی مل جاتی تھی، اب صرف 'جہادِ باہمی' اور 'دوسرے' کو نیچا دکھانے کی بنیاد پر ان قومیتوں کا 'گنبدِ گردوں' قائم ہے۔

(۲) حاشیہ از مترجم: اس وقت نوبیل انعام کے لیے رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ برِصغیر سے اقبال کا نام بھی سامنے آیا تھا۔ ٹیگور کو اس کی ہمہ آشتی اور کسی التزام یا commitment سے ہٹ کر صرف ادبی حیثیت کی بنیاد پر انعام ملا، جبکہ اقبال شعر میں شعریت اور ادبیت کا مظاہرہ کرنے کے باوصف محض اپنی commitment کی بنا پر اس سے محروم رہے۔

(۳) اقبال کے فارسی اور اردو شعری مجموعوں میں ایک 'پیامِ مشرق' (1923ء) ہے جو Goethe کے غرب شرقی دیوان (1818ء) کے جواب میں لکھا گیا، جبکہ وفات کے بعد شائع ہونے والے مجموعے کا نام 'ارمغانِ حجاز' (1938ء) ہے۔ ایک زرخیز طبیعت اور اصالت کے حامل، کثیر التصانیف فلسفی شاعر ہونے کے لحاظ سے اقبال کے بارے میں شائع ہونے والے مطالعہ جات دورِ جدید کے کسی بھی مسلمان مصنف کے بارے میں لکھی گئی تحریروں سے زیادہ ہیں۔ Annemarie Schimmel کی تصنیف Gabriel's Wing (لیڈن، 1963ء) میں اقبال اور اقبال کے بارے میں اس وقت تک ہونے والے مطالعہ جات کی ایک جامع کتابیات موجود ہے۔ حاشیہ از مترجم: یہاں یہ بات دلچسپی مگر افسوس سے خالی نہ ہو گی کہ اقبال پر کتابیں لکھنے اور کتابیات مرتب کرنے والی یہ جرمن مستشرق خاتون، جو اپنی دیگر متنوع لسانی اور علمی و تصنیفی دلچسپیوں کے ساتھ خاص طور پر اقبال کی شیدائی تھی، نیز پاکستان کی علاقائی زبانوں کا مطالعہ بھی اس کی لسانی تحقیقات میں شامل رہا، وہ پاکستان میں دفن ہونے کی خواہش کا اظہار کیا کرتی تھی۔ مگر وفات کے بعد Annemarie Schimmel کی تدفین کی رسوم میں شرکت کے لیے بھی پاکستانی سفارت خانے کو نہ صرف دیر لگی، بلکہ جیسے نہ چاہتے ہوئے وہاں پاکستان کی نمائندگی کی گئی۔ اس صورتِ حال پر بہادرشاہ ظفر کا خود

اپنے بارے میں کہا ہوا ایک شعر ذرا لفظی تصرف سے یوں منطبق آتا ہے: (کتنی ہے بدنصیب شمل، دفن کے لیے :: دوگز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں)۔

(۴) دائمی حیثیت کے حامل، ناقابلِ مفاہمت اور بتکرار و اصرار سامنے آنے والے 'خدا کی وحدانیت' کے پیغام کو قبول کرنے کے 'فریضۂ انسانیت' کے سلسلے میں قرآن کے یہ مقامات دیکھیے: الإخلاص: 1-4؛ المؤمنون: 91؛ آل عمران: 64، 79-80؛ الأعراف: 59، 65، 73، 85؛ نیز ملاحظہ کیجیے: ہود: 50، 61، 84؛ النحل: 36؛ اور الأنبیاء: 22، 25۔ زندگی کے تمام شعبوں میں انصاف (قسط اور عدل) کا عظیم فریضہ بروئے لانے کے سلسلے میں قرآن کے یہ مقامات دیکھیے: الحدید: 25؛ النحل: 90؛ الأعراف: 29؛ النساء: 58، 127، 135؛ المائدہ: 8، 42؛ ہود: 85؛ الممتحنۃ: 8؛ الرحمٰن: 9۔ حاشیہ از مترجم: پوری انسانیت ایک طرف، اقبال نے کہا تھا: (کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک)۔ یعنی 'توحید' کوئی دیومالائی اور وہمی و تخیلاتی بات نہیں کہ کائنات کے کسی کونے میں ایک خلائی مخلوق پائی جاتی ہے جو 'واحد' ہے، 'لاشریک' اور 'بے ہمتا' ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ 'بے نیاز' بھی ہے ......(کہ جس پر شاعر کو کہنا پڑے: او بے نیاز مرے، سخت بے نیاز خدا :: نیاز مند اٹھائیں اذیتیں کیا کیا!!)....... بس یہ بات مان لی جائے کہ یہ 'خیالی مخلوق' ہے، اور اس کے سامنے ماتھا ٹیک لیا جائے تو سب مسائل و تکالیف کا حل نکل آئے گا۔ خواہ آپس کی مخالفتیں، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی مادی و معنوی کوششیں اور دشمنیاں اسی طرح چلتی رہیں۔ حالانکہ خدا کی وحدانیت کا اطلاقی مطلب انسانوں کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنا ہے، جو مثالی (ideal) ہونے کے ناتے ممکنہ طور پر ہی بروئے کار لائی جا سکتی ہے، اور اس ideal کی حتی الامکان پیروی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر اس سلسلے میں کوئی 'سلسلۂ جنبانی' ہی عمل میں نہ آئے، بلکہ مادی نیز معنوی وسائل سے ایک دوسرے کا قلع قمع کرنے کی کارروائیاں کی جاتی رہیں، تو انسان کی 'اکائی کا بدن بھی کٹ' جاتا ہے اور 'خدا بھی خداؤں میں بٹ' جاتا ہے۔ اسی بات کا پرتو معاشرے میں عدل اور انصاف کے حوالے سے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، جو ایک واضح بات ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے ہاں ان پڑھ طبقہ ایک طرف، پڑھا لکھا اور مقتدر طبقہ بھی آغازِ کار ہی سے پاکستان میں سماجی و معاشی عدل و انصاف کی راہ میں رکاوٹ رہا۔ جس کسی نے، خواہ اپنی ذات کی حد تک نظری کوشش ہی کی اسے چلوں وظائف پر یا یکسر ہی ٹھکانے لگا دیا گیا۔ اسی طرح مذہب کے نام پر بھی عوام و خواص کا استحصال کیا گیا، اور علماء و مشائخ، مقتدر طبقے کی خالی شہ پر اور کبھی کسی نہ کسی انداز کی رشوت لے کر باہمی منافرت میں حصہ ڈالتے رہے۔ فرقہ دارانہ اور پیرانہ ہتھکنڈوں سے مذہب اور 'روحانیات' کے نام پر لوگوں کا جینا محال کیا گیا، اور یوں 'رب المشرقین'، 'رب المغربین' بننے کے بعد 'رب العالمین' کے منصب سے بھی علیحدہ ہو گیا۔ نتیجتاً بیرونی و اندرونی دشمنوں کے پو بارہ ہوئے۔ 'واحد' وظائف اور چلوں کی چاٹ پر لگ گیا، اور مادی و معنوی وسائل کا سہارا لینے والے دشمنوں کا 'پنجہ' گھی میں۔ ایک خدا کی عبادت محض ماتھا ٹیک لینے اور چلے وظائف کر لینے سے عبارت نہیں، بلکہ (صلوٰۃ) عملی زندگی پر منطبق ہونے والی شے ہے۔ اگر یہ لوگوں کو 'فحشاء و منکر' سے نہیں روکتی، انسانیت کش اور سماج دشمن سرگرمیوں کے مادی و معنوی نفاذ، فروغ اور اثراندازیوں کا قلع قمع کرنے میں مدد نہیں دیتی، تو نہ صرف تقویٰ کی تبلیغ کر لینے سے کچھ حاصل وصول نہیں، بلکہ یہ 'کم سوادی' و 'کورذوقی' کی دلیل ہے۔ صلوٰۃ کی تعریف (definition) کے لیے ملاحظہ ہو خود قرآن کی وضاحت: (**قالوا: یاشعیب، اصلاتک تأمر اَن نترک ما یعبد آباؤنا**)۔

(۵) 1932ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اِلٰہ آباد میں منعقد ہونے والے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اقبال نے کہا: ''میں قومیت (Nationalism) کے یورپ میں رائج تصور کا صریح مخالف ہوں۔ اس

لیے نہیں کہ اگر اسے ہندوستان میں پنپنے کی اجازت دی گئی تو مسلمانوں کو اس سے بہت کم مادی فوائد حاصل ہوں گے۔ [بلکہ] میں اس کا بدیں وجہ مخالف ہوں کہ مجھے اس میں لادین مادیت کے عناصر جھلکتے دکھائی دیتے ہیں، جسے میں جدید دور میں انسانیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتا ہوں۔ جو بات واقعی اہمیت رکھتی ہے وہ انسان کا اعتقاد، اس کی ثقافت اور تاریخی روایات ہیں۔ یہ وہ امور ہیں جو میری نظر میں زندہ رہنے کا جواز ہیں، اور جن کی خاطر مرنا گوارا ہو سکتا ہے؛ زمین کے کسی ٹکڑے کے لیے نہیں کہ جس کے ساتھ انسان کی وابستگی عارضی ہوا کرتی ہے۔" مقتبس در Iqbal: His Art and Thought از سید عبدالوحید (لندن، 1959)، صفحہ 21۔ حاشیہ از مترجم: اقبال کے بعض آخری خطوط سے پتا چلتا ہے کہ وہ پاکستان کے معروف تصور کے حق میں نہ تھے، بلکہ مسلم اکثریتی علاقے کو ایک صوبے کی صورت میں ہندوستانی فیڈریشن کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ (دیکھیے: پروفیسر تھامپسن کے نام اقبال کا خط، بتاریخ 4/ مارچ، 1934ء)

(۶) The Prelude، از William Wordsworth، Bk. XI, 11، صفحہ 108-109۔

(۷) حاشیہ از مترجم: مگر حاصل ہونے والی تمام تر کامیابیوں اور امید بھرے نقطہ ہائے نظر اور بلند آہنگ دعاوی کے باوجود، (اے بسا آرزو کہ خاک شدہ)۔ (آئندہ و گزشتہ تمنا و حسرت است :: یک حرف کاشکے ست کہ بصد جا نوشتہ ایم)۔ پاکستانی قوم تیسری دنیا کی دیگر اقوام کی طرح خارجی اور داخلی استعمار سے پورے طور پر نجات حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی، اور یکجہتی و ہم آہنگی، نیز سماجی و معاشی انصاف تا حال ایک خواب ہے جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ مقالہ نگار برادر اسلامی ملک سعودی عرب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس رعایت سے یہاں یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہو گا کہ قیامِ پاکستان سے قبل جب جزیرہ نمائے عرب میں ایک پائیدار فلاحی ریاست قائم کرنے کے لیے سعودی انقلاب نے شریفِ مکہ کی حکومت کا خاتمہ کیا، اور اس دوران وہاں قُبّہ ہائے قبور کو مسمار و ہموار کرنے کی مہم بھی چلائی گئی، اور میلہ و مزار کے خلاف کارروائی عمل میں آئی، تو برِّصغیر میں اس پر کافی واویلا مچا تھا۔ اس پر یہاں کی مسلم عوام کی تسلی کے لیے سمجھ دار علماء و دانشوران کا ایک وفد (بشمول داؤد غزنوی اور ظفر علی خاں) سعودیہ روانہ ہوا، جس نے مَلِک سعود بن عبدالعزیز سے مل کر برِّصغیر کے مسلمانوں کی طرف سے نیک خواہشات کا پیغام پہنچایا، اور وہاں کے حالات کا بھی جائزہ لیا، جو انھیں بہتر نظر آئے۔ پیغمبرؐ کی قبر، جو دیگر مزاروں کی طرح مَنّتیں ماننے کا مرکز بن چکی تھی، اس پر تعمیر 'قُبّۂ خضراء'، البتہ مسلمانوں کی عمومی جذبات کا احترام کرتے ہوئے اسی طرح رہنے دیا گیا تھا۔ تاہم، پیغمبرؐ کی قبر کو پوجنے کی روایت پابندی کی زد میں آ چکی تھی۔ اب جبکہ عرصہ گزر چکا، تیل اور سونے کی خزانے دریافت ہونے کے بعد سعودیہ امیر اور خوشحال ملک کے طور پر جانا جاتا ہے، اور دیگر ممالک میں بھی سعودی ریال ان ملکوں کی افرادی قوت، نیز سعودی ایجنٹوں کے توسط سے پہنچنا ایک عام بات ہے۔ تاہم، قابلِ ملاحظہ بات یہ ہے کہ سعودیہ ظاہری طور پر دوسرے ممالک کی سیاست میں دخل دیے بغیر اپنے اسی مخصوص ایجنٹ طبقے کے ذریعے خود کو ان داتا سمجھتے ہوئے در اندازی ضرور کرتا ہے۔ جبکہ خود اپنے ہاں چند شہری علاقوں سے ہٹ کر باقی آبادی اسی طرح بدو کی بدو اور بدحال نظر آتی ہے۔ معلوم نہیں روایت اور ثقافت کے نام پر ان کی حالت ویسی رکھی گئی ہے، یا ابھی تک، بقولِ اقبال، 'شرعِ پیغمبرؐ' ان پر آشکارا نہیں ہوئی۔ یہاں یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ شریفِ مکہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد سعود بن عبدالعزیز نے مَلِک، یعنی 'بادشاہ' کا لقب کیوں اختیار کیا، کہ جس کے باعث وہ ایک مخصوص مزاج کا حامل حکمران قرار پائے؟ (خادم الحرمین) کا لقب بھی محض مناسک و عبادات کی ادائیگی میں سہولیات فراہم کرنے پر دلالت کرتا ہے، جو عربوں کا اسلام سے پہلے بھی ایک قبائلی عہدہ تھا، یعنی 'سدانۃ الکعبۃ'؛ اس فرق کے ساتھ کہ اب کعبہ کے ساتھ 'مسجدِ نبوی' کا اضافہ

ہو گیا۔ نیز وہاں 'برہمن اور کھتری' کی حکومتی سطح پر تقسیم بھی عمل میں آئی، یعنی 'آلِ سعود' اور 'آلِ شیخ' کی تقسیم، جو محض تنفیذیہ (بشمول عسکریہ) اور مقنّنہ (یا عدلیہ) کی تقسیم نہیں۔ علاوہ بریں، نظریات و اصول کے اختلاف کی بنا پر وہاں علمی سطح پر باہم بات چیت یا واضح عدالتی کارروائی کی بجائے وجہ ظاہر کیے بغیر ایک طرح کی persecution اور نظربندی بھی عمل میں لائی جاتی ہے۔ صرف حکومت کے ہمنوا، جو مل کر مدح کی قوّالی گاتے ہیں، غیر قانونی بلکہ 'حرام و ناجائز' باتوں کی بھی رخصت پاتے ہیں، اور ان اغراض کے لیے دمّام ایسے شہر کے بعد بسہولت بحرین پہنچ جاتے ہیں، جہاں سمندر کے بیچوں بیچ ایک بڑی راستہ بھی بنا دیا گیا ہے۔ ان ہمنواؤں میں بھی اگر کوئی عتاب کی زد میں آ جاتا ہے تو وہ اپنے خلاف ہونے والی کارروائی پر بطور ردِعمل دبئ یا لندن پہنچ کر انٹرنیٹ پر گندی فلمیں جاری کرتا ہے۔ (ضمناً) یہاں 'حرمین' کے حوالے سے ایک اور بات، جو ہمارے مذہبی عقیدے کا حصہ بن چکی ہے، کے متعلق کچھ عرض کرنا بے محل نہ ہو گا۔ 'حرمین'، یعنی مکہ میں کعبہ کی 'مسجدِ حرام' اور مدینہ میں 'مسجدِ نبوی' کے بعد تیسری مسجد، جس کا ذکر پیغمبرؐ سے منسوب ایک قول میں ملتا ہے، 'قدس' میں واقع 'مسجدِ اقصیٰ' ہے، جو پہلے فلسطین کا حصہ تھی، اور اب اس پر اسرائیل کا قبضہ ہے۔ بیت المقدس یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے مشترکہ طور پر احترام اور عقیدت کا حامل رہا ہے، اور اسی رعایت سے اسے مشترکہ شہر قرار دینے کی تجویز سیاسی لحاظ سے یقیناً ایک مناسب اور قابلِ عمل حل ہو سکتا ہے۔ البتہ، 'مسجدِ اقصیٰ' کے بارے میں یہ بات تسلیم کرنے میں دشواری پیش آتی ہے کہ آیا وہ واقعی اس مذہبی تقدس کی حامل ہے جو مسلمانوں کے ہاں اس کے لیے پایا جاتا ہے۔ قرآن میں 'المسجد الاقصیٰ' کا ذکر (**سبحان الذی اَسریٰ بعبده...... الخ**)، پیغمبرؐ کے مکہ سے یثرب ہجرت کرنے کے حوالے سے آیا ہے۔ 'المسجد الحرام' سے دور، یثرب (جسے بعد از مہاجرت شہرِ پیغمبرؐ، یعنی 'مدینۃ النبیؐ' کا نام دیا گیا) میں تعمیر ہونے والی مسجد (جسے پیغمبرؐ سے منسوب کر کے 'مسجدِ نبوی'، کا نام دیا گیا) کو 'مسجدِ اقصیٰ' کہا گیا ہے، خاص طور پر جبکہ 'قدس' کی 'مسجدِ اقصیٰ' کو اس کا یہ نام تاریخی لحاظ سے بہت بعد میں دیا گیا۔ قرآن کے مذکورہ صدر الفاظ نیز کچھ دیگر آیات کے حوالے سے 'معراج کا قصہ' بھی بیان کیا جاتا ہے، جو دراصل 'الٰہیات و کلامیات' کا مسئلہ ہے، جس کے بارے میں جسمانی اور روحانی معراج کی دو آراء بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن 'معراج کے قصے' اور 'الٰہیات کے مسئلے' سے قطعِ نظر، اگر قرآن کے ان مقامات کو سامنے رکھا جائے جن سے مجموعی طور پر معراج کا واقعہ نکالا جاتا ہے، (اور مختلف منسوب روایات سے اس کی سند حاصل کی جاتی ہے)، تو سیاق و سباق سے یہی واضح ہوتا ہے کہ 'افقِ اعلیٰ' اور 'قاب قوسین' کی بلاغی تراکیب ایک طرف پیغمبرؐ کی وسعتِ ذہنی اور بلندیِ نظر، اور دوسری جانب معاشرے اور نفسِ انسانی کی گہرائیوں سے واقفیت پر دلالت کرتی ہیں، نہ کہ کسی اسطورے میں عاشق و معشوق (خدا و مصطفیٰ) کی ملاقات کے لذیذ واقعے کو بیان کرتی ہیں۔

(۸) (اقبال)۔

(۹) بائیبل (King James کا نسخہ) متّی، 7: 20۔

(۱۰) قرآن، الزمر: 53، ﴿**لا تقنطوا من رحمة الله....**﴾

(۱۱) مغرب کے لیے ایک خطرے کے طور پر اسلام کو اسطورہ بنا کر پیش کرنے کے بارے میں مغربی اسکالروں کے متوازن اور تنقیدی اندازِ نظر کے لیے مثال کے طور پر دیکھیے: John L Esposito کی اس سلسلے کا آغاز کرنے والی کتاب The Islamic Threat: Myth and Reality? (نیو یارک، آکسفورڈ، پیپر بیک ایڈیشن پر ایک نئے دیباچے کے ساتھ، 1993ء)؛ اور Fred Halliday کی Islam and the

Myth of Confrontation: Religion and Politics in the Middle East (لندن، نیویارک، 1996ء)۔ ان اسکالروں کے برعکس، جو ثقافتی اور تہذیبی امتزاج کے حامل تعاون پر یقین رکھتے ہیں، بلند آہنگ لہجے میں نسل پرستی کی تمجید، یاس و قنوطیت اور تہذیبی کشمکش کے حق میں نغمہ سرا محققین کا گروہ بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے: The Clash of Civilizations and the Remaking of the World Order (نیویارک، 1996ء) میں Samuel P Huntington کا موقف، اور The Roots of Muslim Rage (ستمبر 1990ء) میں شائع شدہ مقالے Atalantic Monthly, 266 سمیت اپنی نظریاتی لحاظ سے متأثر مختلف تحریروں میں Bernard Lewis کا نقطۂ نظر۔ Huntington اور اس کے ہمنوا حلقے کی کشمکش کے نقطۂ نظر کی حامل مفروضہ رائے پر تنقید کے لیے دیکھیے: Clash of Civilizations and the Democratic Discourse: The Islamic Challenge، از Amr Sabet، Middle East Affairs Journal (کوالالمپور)، 2 (Summer/Fall 1996)، صفحہ 39-55۔

(۱۲) حاشیہ از مترجم: Secularism، نیز Pluralism کے پیش کردہ تصورات نظریاتی لحاظ سے دھوکے کی ٹٹی اور عملی طور پر صفر پیشرفت کے حامل نظر آتے ہیں۔ حکومت اور پالیسی ساز ادارے، باندازِ دگر، مخصوص مذہبی سوچ رکھنے والے، انتہاپسند نقطۂ نظر کے حامل لوگوں ہی کے قبضے میں ہیں۔ جارج بش اور پھر جارج ڈبلیو بش اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور اسی طرح ان کے یورپی ہمنوا۔ نیز انتہا پسند صہیونی یہودی لابی کی حکومتی اور غیر حکومتی اداروں میں کارفرمائی بھی دنیا کے لیے کوئی راز کی بات نہیں۔

(۱۳) حاشیہ از مترجم: اب بات آگے بڑھ چکی ہے، اور ان تعلیمی ریسرچز پر مبنی سیاسی اور عسکری پالیسی کے بروئے کار لائے جانے سے دنیا کا منظر نامہ ایک طرح سے جنگ و جدل کا نقشہ پیش کرتا ہے، جسے صلیبی جنگوں، دو معروف عالمی جنگوں اور سرد جنگ کے بعد بشمول پہلی جنگِ خلیج، پانچویں عالمی جنگ کا نام دیا جا سکتا ہے۔

(۱۴) حاشیہ از مترجم: یہ زرمیہ نظمیں فرانس کے داستان سرا شعرا نے گیارھویں صدی سے لے کر تیرھویں صدی عیسوی کے دوران زبانی روایت کے طور پر ترتیب دیں۔ یہ نظمیں عیسائی جنگی کارروائیوں، بہادری، لڑائی کی مہارت، جنگی حکمتِ عملی، نیز وفاداریوں اور اس حوالے سے فرانس کے ارستقراطی طبقے کی تاریخ کو افسانوی داستان کے انداز میں پیش کرتی ہیں۔ عام طور پر ان میں مسلمانوں کو دشمن تصور کرتے ہوئے (کسی حد تک 'داستانِ امیر حمزہ' کے مماثل) لڑائی کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔

(۱۵) ابتدائی اور جدید ادوار میں مغرب، بشمول شمالی امریکا، میں اسلام کی تصویر کشی کے ارتقا سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے ذیل کی تصانیف اور ان میں درج کتابیات کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ Orientalism، از Edward W Said (لندن اور Henley، 1978ء)، عربی ترجمہ از کمال ابو دیب، بعنوان: 'الاستشراق' (بیروت، 1981ء)؛ Culture and Imperialism، از مصنفِ سابق، (نیویارک، 1993ء)، جس کا ایس پرویز منظور نے Return to Tribalism: End of Empire and the Quest for Western Identity، شائع شدہ در Muslim World Review, 14:3، (1994ء)، صفحہ 3-6، میں اپنے امتیازی طور پر بصیرت آگیں، دلچسپ اور قطعی انداز سے جائزہ لیا ہے؛ Europe's Myths of Orient، از Rana Kabbani (Rana Qabbani)، (لندن، 1986ء)؛ The Western Image and Western Studies of Islam، از Maxime Rodinson، شائع شدہ در The

Legacy of Islam مرتبہ: J Schacht مع C E Bosworth، دوسرا ایڈیشن (آکسفورڈ، 1974ء)، صفحہ 62-9؛ Europe and Mystique of Islam، از مصنفِ سابق، (Seattle، لندن، 1987ء)، ترجمہ کردہ از فرانسیسی ایڈیشن La fascination de l'Islam، از Roger Veinus، (پیرس، 1980ء)؛ Islam and the West: the Making of an Image، از Norman Daniel، نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن (آکسفورڈ، 1993ء)، اشاعتِ اول، (Edinburgh، 1960ء)؛ Islam, Europe and Empire، از مصنفِ سابق، (Edinburgh، 1966ء)؛ The Arabs and Mediaeval Europe، از مصنفِ سابق، دوسرا ایڈیشن (لندن اور نیویارک، 1979ء)؛ Heroes and Saracens: An Interpretation of the Chansons de Geste، از مصنفِ سابق، (Edinburgh، 1984ء)، جس میں عربوں اور مسلمانوں کی 'قرونِ وسطیٰ' کے ان مقبول گیتوں میں مسخ شدہ یورپی صورت گری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز دیکھیے: Western Views of Islam in the Middle Ages، از RW Southern، (کیمبرج، Mass.، 1962ء)؛ Islam and Arabs in Early American Thought: The Roots of Orientalism in America، از Fuad Sha'ban، (Durham, N C، 1991ء)؛ Western Attitudes to Islam، شائع شدہ در Europe and the Middle East، (Berkeley اور Los Angeles، 1980ء)، صفحہ 18-1؛ Muslims and Christians، شائع شدہ در کتابِ سابق الذکر، صفحہ 80-74؛ The European Mentality and Islam، شائع شدہ در Islamic Studies, 35:1، (1996ء)، صفحہ 97-87؛ اور Christendom vs. Islam: 14 Centuries of Interaction and Co-existance، شائع شدہ در Introduction to Islamic Civilization، مرتبہ: R M Savory، (لندن، نیویارک، Melbourne، 1976ء)، صفحہ 135-127۔ معاصر مغرب میں عربوں، مسلمانوں اور اسلام کی تصویر کشی کے بہت سے مطالعے پائے جاتے ہیں، جن میں Covering Islam: How the Media and the Experts Determine How we see the Rest of the World، از Edward Said، (نیویارک، 1981ء)؛ اور '**صورة العرب فی الصحافة البریطانیه: دراسة اجتماعیة للثبات والتغیر فی مجمل الصورة**' از حلمی خضر ساری، عربی ترجمہ از: عطاء عبد الوہاب، (بیروت، 1988ء)۔ مغربی ذرائع ابلاغ کی خلق کردہ مسخ شدہ مسلم دشمن تصویر کشی کی نوعیت اور مسلمانوں کے کمزور جواب کی جانچ کے لیے دیکھیے: Islam and the Global Challenge: Dealing with Distortion of the Image of Islam by Global Media، از Louay Safi، شائع شدہ در Islamic Studies, 35:2، (1996ء)، صفحہ 202-191۔ یہ تعصب ان کتب و مقالات میں بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے: The TV Arab، از Jack G Shaheen، (Browling Green، Ohio، 1984ء)؛ Arab and Muslim Stereotyping in American Popular Culture، از مصنفِ سابق، (واشنگٹن ڈی سی، 1997ء)؛ Arab Images in American Popular Comic Books، از مصنفِ سابق، شائع شدہ در Journal of Popular Culture, Vol,28:1، صفحہ 133-123؛ اور The Muslim Image in Contemporary American Fiction، از Rasha al-Disuqi، شائع شدہ در Islamic Studies, 31:2، (1992ء)، صفحہ 184-169۔

(۱۶) **حاشیہ از مترجم:** چرچ اور بادشاہ کے گٹھ جوڑ، اور اسی طرز پر علماء اور دربارِ شاہی کے باہمی مفادات کی وابستگی

(جس نے حکمران کو 'ظِلّ اللہ فی الارض' کہلوایا) نے لوگوں کو مزاروں اور پیر پرستی کی ذلت پناہی یا جرم و گناہ کی حسّت مآبی کی جانب دھکیلا۔ اس سے ہٹ کر اگر کوئی راہ اپنائی گئی تو وہ جنونیت (fanaticism) کی راہ تھی، یعنی 'فدائی حملے' اور 'جہاد بالسیف کی نجکاری'؛ جس کے لیے کبھی حسن بن صباح کی طرح 'لذّتِ برگِ حشیش'، اور کبھی صرف انتہا پسند نظریات کو قوتِ محرکہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ورنہ واضح طور پر قانونی یا عرفی لحاظ سے معاشی مفادات، معاشرتی حقوق اور انفرادی و اجتماعی طور پر ایک دوسرے کا وجود تسلیم کرنے کی بجائے اندر خانے مفاہمت کی راہ اپنائی گئی۔ یہی وہ صورتِ حال تھی جسے دیکھتے ہوئے اقبال کے ابلیس نے ایک طرف جبریل سے ہم کلام ہو کر کہا تھا: (میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح :: تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو!)، اور دوسری جانب یزداں سے مخاطب ہو کر اپنی بلند آہنگ فریاد کی کہ تو نے یہ کس قسم کے زنخے انسان تخلیق کیے ہیں جو بس ایک گھرکی سے خوف کھا کر میری جھولی میں آ بیٹھتے ہیں۔ کوئی ایسا حق اور سچ کا علم بردار، زندگی کا حامل، صاحبِ کردار مرد میرے مقابلے پر لا کہ مَیں جس سے شکست کھانے میں بھی فخر محسوس کروں۔ (اے خدا! یک زندہ مردِ حق پرست :: لذّتے یابم کہ شاید در شکست)۔ ہمارے ہاں حلاّج، قرّۃ العین طاہرہ اور محمد رضا عشقی کے بعد یاس یگانہ چنگیزی اور غالب باقی بچتے ہیں۔ یگانہ کو مذہب و روحانیات کے کچھ نام نہاد ٹھیکیداروں نے ذلیل کیا، اور غالب نے بیعت کر رکھی تھی۔ لے دے کے اقبال کا ابلیس اور Milton کا Satan خدائی 'ملبے کے ڈھیر میں تنہا کھڑے' نظر آتے ہیں۔ علماء، تاریخی طور پر، 'اِحقاقِ حق' اور 'اِبطالِ باطل' کے نام پر اصل مسائل سے گریز کرتے نظر آتے ہیں۔ قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کے خالص نظری اور کلامی مسئلے پر کوڑے لگوانے اور کوڑے کھانے، یا شیعہ سنی اور سلفی غیر سلفی، نیز قدیم اور جدید کی معاندانہ کشمکش سے لوگوں کو کیا فائدہ ہوا۔ دوسرے جہان والی آخرت (hereafter) دور کی بات ہے، اس دنیا کی آخرت (مستقبل) کے لحاظ سے انسان ہاتھ کیا آیا؟ قرآن کا فرمان ہے: (من كان في هٰذه اَعمىٰ، فهو في الآخرة اَعمىٰ). اب یہاں لفظی مطلب لینے بجائے ان الفاظ کا figurative اور metaphorical مفہوم دیکھا جائے، ورنہ سعودیہ کے مرحوم نابینا مفتی ابنِ باز اور مصر کے مرحوم بینا فقیہ محمد الغزالی کے درمیان بیان کی جانے والی دلچسپ مگر افسوس ناک تلخ کلامی دہرانا پڑے گی۔ بہرکیف، قرآن کے مذکورہ الفاظ سے سمجھ میں آنے والے مجازی اور بلاغی معانی یہی ہیں کہ: 'اگر یہاں کا مستقبل محفوظ نہیں، تو وہاں کی جنت کے خواب کیونکر دیکھیے گا؟!'

(۱۷) قرآن، البقرۃ: 256، ﴿لا إكراه في الدين....﴾

(۱۸) حاشیہ از مترجم: طُرفہ تضاد ہے کہ خود مسلمانوں کے ہاں ان کے مختلف فرقوں کے مابین سرپھٹول کا سلسلہ کافی عرصہ سے چلا آ رہا ہے، اور ان میں ہم آہنگی دیوانے کا خواب نظر آتی ہے۔ کسی ٹھوس بنیاد پر کوئی اختلافی رائے رکھنے والے کا معاشرتی بائیکاٹ، نیز مادی و معنوی عناصر کو استعمال کرتے ہوئے ایک طرح کی انٹیلی جنس بندش لگا کر اس کا جینا محال کرنا مسلم معاشروں کی عام روایت بن چکی ہے۔

(۱۹) حاشیہ از مترجم: اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندو قوم، جسے 'اکّال الأمم' کہا گیا ہے، باقی ہر قوم اور مذہب کو ضم کرتی چلی گئی، مگر مسلمانوں کو خود میں ضم نہ کر سکی، پرامن بقائے باہمی کا سلسلہ اگرچہ بعد میں کچھ عرصہ چلا۔ مسلمانوں کا ہندو قوم میں ضم نہ ہونے کا بنیادی سبب یہ تھا کہ مسلمان وثنیت یا بت پرستی کے قائل نہ تھے۔ تاہم عملی لحاظ سے، خارجی قالب کی الگ پہچان کے باوجود، مسلمان داخلی طور پر بڑی حد تک ہندوانہ رنگ میں رنگ گئے۔ یعنی ہندو اگر کھڑے پتھروں (مورتیوں) کو پوجتے تھے تو یہ پڑے پتھروں (قبروں) کو پوجنے لگے۔ یوں کعبہ ایک بار پھر بتوں سے بھر گیا، مگر یہ قبّہ و مزار کی شکل کے بت تھے، جس کے ساتھ

جوگیوں یوگیوں کے متوازی روحانیات کے نام پر داخلی آویزش کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا، جس کے تحت لوگوں کو اپنے ڈھرّے پر لانے کے لیے خفیہ مابعدالطبیعیاتی ہتھکنڈے اپنائے گئے...... (اس روحانیات کو خود مسلمانوں کے ہاں گمراہی (ضلالت) کا نام دیا گیا؛ وہ عالمگیر گمراہی جس نے دنیا کے عوام و خواص سبھی کو متأثر کیا۔ مذہب کے نام پر اگر بازو مروڑ کر فرقہ جاتی معتقدات منوانے، ورنہ تفسیق و تکفیر اور ارتداد کی ظاہری سزا لاگو کرنے کی حکمتِ عملی اپنائی گئی، تو روحانیات کے نام پر خفیہ بندشوں کا سلسلہ شروع کیا گیا، تاکہ لوگ پیروں اور ان کے مزاروں پر جائیں اور چڑھاوے چڑھائیں۔ اس روحانیات کو ضلالت کا نام دیے جانے کی سند کے لیے دیکھیے: جاوید احمد غامدی کا اصل و اصیل مصادر کو سامنے رکھتے ہوئے تصوف پر تفصیلی مضمون؛ نیز یوسف سلیم چشتی کا تحریر کردہ کتابچہ 'اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش'، جو یوسف سلیم چشتی ہی کی کتاب 'تاریخ تصوف' میں بوجوہ شامل نہیں کیا گیا)...... اُدھر حجاز میں شریفِ مکہ کے دور تک آتے آتے اصل کعبہ کے گرد بھی مزار اگ آئے۔ مِلک سعود نے باقی تمام مزار اور قبّے تو زمین کے برابر کر دیے، مگر پیغمبرؐ کی قبر پر تعمیر کیا گیا، منّت اور پوجا کی علامت قبّہ برقرار رکھا۔ یہی سبز قبّہ (گنبدِ خضرا) آج تک سادہ لوح مسلمانوں کی خوش عقیدگی کا استحصال کرنے کے لیے بطور علامت استعمال ہوتا آیا ہے۔ دوسری طرف کعبہ اور اس کے غلاف کا سیاہ رنگ کچھ دیگر لوگوں کی نفس پروری کے لیے استعمال کیا گیا۔ یعنی مسلمانوں کے ہاں بے سروپا روایات کی دیومالا میں ایک بے اصل روایت یہ بھی ہے کہ کعبے کے اندر علیؓ بن ابی طالب کی پیدائش ہوئی یا ان کی نال وہاں گڑی ہے۔ مقابل میں احرام کا سفید رنگ امریکہ کے وھائیٹ ہاؤس کی علامت شمار کیا جانے لگا۔ یوں کہ بیتِ اسود (کعبہ) کے گرد بیتِ ابیض (وھائیٹ ہاؤس) نے سیاسی، عسکری اور تجارتی گھیرا ڈال رکھا ہے، اور واقعاتی طور پر جارج بش کے بعد پھر جارج ڈبلیو بش (خادم الحرمین) بنایا گیا۔ سعودی کِنگ کے امریکہ بش فیملی کے ساتھ تعلقات کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ نیز سعودی رائل فیملی (آلِ سعود) کے داخلی اختلافات سے قطعِ نظر، ان کا مطمحِ نظر ابیقوریت (Epicurainism) کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا، یعنی 'کھاؤ، پیو اور عیش کرؤ۔ علاوہ بریں، (ہامانیت) کا منصب سنبھالے محمد بن عبد الوہاب النجدی کی نسل، جو (آل الشیخ) کہلاتی ہے، 'عقیدے' کے نام پر پوری مسلم دنیا میں خفیہ و بر ملا ذرائع اپنا کر جنونیت (fanaticism) پھیلاتی آئی ہے۔ غیر مسلموں کے بارے میں بات کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لیے اپنے گریبان، بلکہ آستین میں جھانک کر دیکھنا نہایت ضروری ہے، تاکہ اپنوں کی ستم رانیوں اور وحشت سامانیوں سے بھی جان سمجھ کر، علیٰ وجہ البصیرت نبٹا جا سکتا۔ (ہر کس از دستِ 'غیر' نالہ کند :: مسلم از 'خویش و خویشتن' فریاد!)۔

(۲۰) حاشیہ از مترجم: یعنی لاہوت و ناسوت کا اجتماع، جسے مسلمانوں کے ہاں حلول کا نام دیا جاتا ہے، جو تصوف کی ایک اصطلاح ہے۔ اس طرح 'وحدت الوجود' کے مقابل 'وحدت الشہود' کی صوفی تقسیم عمل میں آئی۔ جبکہ شاہ ولی اللہ کی 'تحقیق' ہے کہ 'وحدت الوجود' اور 'وحدت الشہود' ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور ان کا فرق صرف اصطلاح کا فرق ہے، ورنہ حقیقت میں 'شہود و وجود' میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ (ضمناً) وجود و شہود کے مسائل، نیز مجموعی لحاظ سے تصوف کو اگر ایک طرف پڑھے لکھے حلقوں میں ایک فلسفیانہ اور کسی حد تک الٰہیاتی مسئلے کے طور پر لیا جاتا، اور دوسری جانب عوام الناس کے اندر اخلاق و آداب کی آبیاری و بالیدگی کے لیے استعمال کیا جاتا تو یقیناً بہت مفید رہتا، مگر اس کے اصل مطالب و اغراض کو خلط ملط کر کے شریعت کے مقابل ایک متوازی مذہب کے طور پیش کیا گیا، جس سے نہ شریعت لوگوں کے مسائل حل کر سکی، نہ طریقت سے معاشرے میں سفلہ کیشی و دوں نہادی کا مداوا ہو سکا۔ یعنی ایک جانب علمائے شریعت حکمرانوں کی

رہنمائی کا فریضہ ادا نہ کر سکے، تو دوسری طرف ہمارے صلحاء و مشائخ عوام میں شعبدہ بازی کی سطح سے اوپر نہ اٹھ سکے۔ بلکہ نفس پروری اور جاہ طلبی ان کا مطلوب ومقصود بن گیا، نیز ہر فریق اور ان کی داخلی تقسیموں میں سے ہر ایک خود کو حق کا علم بردار، بلکہ اوتار گردانںے لگا۔

(۲۱) حاشیہ از مترجم: اس کے ساتھ مرنے کے بعد جی اٹھنے کا عقیدہ بھی شامل ہے۔ تصلیب اور مرنے کے بعد جی اٹھنے کا عیسائی عقیدہ، اسرائیلی روایت کے طور پر مسلمانوں کے ہاں بھی روایات کے شوق اور چلن کے لحاظ سے دیگر اسرائیلی روایات کی طرح پہلے داستان سرائی کے لیے بیان کیا جاتا رہا۔ (پیغمبرؐ نے بعض مسلمان ہو چکنے والے 'رہبان و احبار' کو اپنی محفلوں میں مذہب کے نام پر ایسے قصے بیان کرنے سے بطور خاص روکا تھا)۔ پھر یہ اسرائیلی روایت بھی قرآن کی تفسیر و تشریح میں حسبِ دل خواہ ذرا ردّو بدل کے ساتھ ذکر کی جانے لگی، اور مسیحؑ کے زندہ آسمان پر اٹھا لیے جانے اور قربِ قیامت میں زمین پر اترنے (نزول) کا عقیدہ مسلمانوں کے ہاں رواج پا گیا، جسے مسلمانوں کے ہاں دیگر سیاسی و مذہبی فرقہ جاتی روایات کے ساتھ ملا کر باقاعدہ ایک اسطورہ (myth) تشکیل دیا گیا کہ قدس کی مسجدِ اقصیٰ کے گنبد پر عیسیٰؑ کا نزول ہو گا، اور اہلِ تشیع کی خاص روایات میں مذکور بارھویں امامِ غائب جنابِ مہدی کا، 'دشمنوں' سے بچا کر اپنے پاس محفوظ رکھے ستر ہاتھ لمبے اصل قرآن کو ساتھ لیے ایک غار میں سے لمبی روپوشی کے بعد ظہور ہو چکا ہو گا، وہ مسیحؑ کا استقبال کریں گے، اور کسی 'دجّال' نامی شخص کو ڈھونڈ کر قتل کر دیا جائے گا۔ قرآن کے مسیحؑ کے بارے میں الفاظ (**اِنی متوفیک ورافعک الیّ**) میں 'متوفّی' کا لفظ فوت کرنے والے، موت دینے والے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جبکہ 'رافع' کا لفظ قدر و منزلت بلند کرنے اور شان بڑھانے کے مفہوم میں آیا ہے۔ سابق شیخ الازہر محمود شلتوت کی 'استقرائی' تحقیق کے مطابق قرآن میں 'توفّی' کا لفظ خدا کی طرف منسوب ہو کر صرف اور صرف وفات دینے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اقبال کی درخواست پر بخاری میں مذکور نزولِ مسیحؑ سے متعلق روایات پر ڈھاکہ کے تمنا عمادی نے 'روایت' کے لحاظ سے، نیز عقل و قرائن یا 'درایت' کے اعتبار سے تنقیدی نظر ڈالی اور انھیں بے اصل ثابت کیا۔ قادیانیوں کے بارے میں اقبال کے کسی بیان میں پائے جانے والے اشتباہ کے پیشِ نظر فرقۂ اہلِ حدیث کے کچھ 'علماء' اقبال کے پاس آئے اور شبہے والی بات کو واضح کرنے کے لیے کہا۔ اقبال نے مطلب کی بات لکھ دی۔ مگر ان کا تقاضا تھا کہ اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا جائے کہ 'حدیثِ صحیح' کی رو سے اقبال نزولِ مسیحؑ کے قائل ہیں۔ اقبال نے اس سے انکار کیا۔ اس پر وہ برافروختہ ہو گئے، اور کہا کہ حدیثوں پر اعتبار نہیں کیا جائے گا تو نماز تک کے مسائل کیسے واضح ہوں گے۔ اقبال نے اس کا خاصا سخت جواب دیا کہ 'میں اعتقادی امور میں قرآن پر اعتماد کرتا ہوں، حدیثوں کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ وہ کن ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں۔ خود محدثین کے نزدیک ان کی حیثیت 'ظنی'، یعنی شک اور گمان کی حامل ہے۔ اور جہاں تک نماز کا تعلق ہے تو مجھے قرآن میں آپ لوگوں کی فرقہ جاتی نمازوں کا سرے سے وجود ہی نظر نہیں آتا'۔

(۲۲) حاشیہ از مترجم: اسلام کے 'heresy' ہونے کی بات، جیسے کہ متن کے آئندہ پیراگراف سے ظاہر ہے، اسے عیسائیت میں ضم کرنے کے لیے کہی گئی۔ چھوٹی بڑی دیگر ''بداعتقادیوں یا بدعتوں'' سے ہٹ کر عیسائیت میں سب سے بڑی اور اہم 'بداعتقادی' (heresy) جرمن پادری Martin Luther کی ہے، جو بہت بعد کی بات ہے، اور جسے آخرِ کار 'رومن کیتھولک چرچ' کے مقابل خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی 'پروٹسٹنٹ اصلاح' نے عیسائیت کو نئی ڈگر پر ڈال کر یورپ کو قرونِ وسطیٰ سے نکلنے میں مدد دی۔ اسلام کو، البتہ، اپنی تمام تر واضح تعلیمات اور ماضی کی روایت میں پیوست رہتے ہوئے تازہ کاری و نو فکری کی دعوت دینے کے

باوجود، توہمات اور روایات کی مذہبی دیومالا سے نکالنے اور اپنی 'تہذیب و تشذیب' کے لیے، اقبال کے بقول، کسی مارٹن لوتھر کی اشد ضرورت ہے۔

(۲۳) Islam and the West، از Arnold Toynbee، [شائع شدہ] در The World and the West، (لندن، 1953ء)، صفحہ 18-19۔

(۲۴) اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ پر تنقید کے اولین مؤسس و رہنما یوحنا دمشقی، اس کے خاندان اور اس کے مذہبی اور اموی ملازمت کے پسِ منظر کے تفصیلی مطالعے، نیز خاص طور پر اسلام کے خلاف اس کی مناظرہ جاتی تحریروں کے انگریزی ترجمے کے لیے دیکھیے: John of Damascus: The Heresy of "Ishmaelites"، از Daniel J Sahas، (لیڈن، 1972ء)؛ یوحنا دمشقی کے بارے میں عموماً، اور خاص طور پر اسلام کے خلاف اس کی مناظرہ جاتی حیثیت کے لیے Jaroslav Pelikan کی پانچ جلدوں میں عیسائیت کے بارے میں نہایت اہمیت کی حامل تصنیف کے متعلقہ حصے دیکھیے: The Christian Tradition: A History of the Development of Doctrine، جلد دوم بعنوان: The Spirit of Eastern Christendom (600-1700)، (Chicago، 1974ء)، خاص طور پر صفحات 227-242؛ نیز دیکھیے: Tohn Damascene, St.، از B Kotter، شائع شدہ در New Catholic Encyclopedia، (Palatine, IL، 1967ء)، طبعِ مکرر 1981ء؛ 17 جلدیں، جلد VII، صفحہ 1047-1049؛ Butler's Lives of the Saints، مرتبہ: Herbertاور Donald Attwater، (نیویارک، 1956ء)، صفحہ 689-691۔

(۲۵) Charles the Great (742-814ء)، فرانس کا بادشاہ، جس نے اپنے شاہی قلمرو کو وسعت دے کر بڑی سلطنت تشکیل دی۔

(۲۶) حاشیہ از مترجم: شاعری میں دیگر اصناف کے علاوہ ایک خاص الخاص اندلسی صنف ''موشّح'' کے نام سے معروف ہے، جو مسلم دنیا کے مشرقی حصے میں بھی مقبول ہوئی۔ یہ ترکیب بند اور ترجیع بند کے انداز کی ایک معیاری شعری صنف ہے۔ البتہ کبھی کبھی اس میں تازگی اور زندگی کی علامت کے طور پر اندلس کے مقامی عربی لہجے کی آمیزش بھی کی جاتی تھی۔ تطیلہ کا ایک نابینا شاعر (الاعمیٰ التطیلی) اس صنف کے مقبول ترین شاعروں میں سے تھا۔ اندلسی ادب اور خاص طور پر ''موشّح'' کے موضوع پر تصنیف کی جانے والی کتب میں یہ دلچسپ واقعہ مذکور ہے کہ ایک شعری محفل میں جب اعمیٰ تطیلی نے اپنے موشّح کا آغاز کیا کہ: (**ضاحک عن جمان :: سافر عن بدرٍ // ضاق عنه زمان :: وحواه صدری**)، تو مشاعرے میں موجود باقی تمام شعراء نے اپنے موشّحے پھاڑ کر پھینک دیے، کہ وہ فنی اور لسانی اعتبار، نیز لطفِ سخن اور ذوقِ شعری کے لحاظ سے اس پائے کو نہیں پہنچتے تھے۔ یہاں ایک قابلِ ملاحظہ بات یہ ہے کہ اس موشّح میں، جیسے کہ مذکورہ مصرعوں سے ظاہر ہے، محبوب کے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسے تنقید میں ''غزل بالمذکر'' کا نام دیا جاتا ہے، جس کا دیگر اقوام کے ساتھ میل جول سے عربی شاعری میں کسی قدر رواج ہو چلا تھا۔ ورنہ عربی شاعری میں اس قسم کا غیر فطری پیار نہیں پایا جاتا تھا، جیسے کہ فارسی اور اس کے تتبع میں اردو شاعری میں پایا جاتا ہے۔ [مترجم]

(۲۷) حاشیہ از مترجم: یہ صورتِ حال بعینہٖ تو نہیں، البتہ کسی حد تک مسلمانوں کو برِصغیر میں پیش آنے والے حالات سے مشابہ ہے۔ ہندو، جو ہر خارجی اور داخلی 'غیر' کو اپنے مذہب میں شامل کرتے چلے گئے، مسلمانوں کو خود میں ضم نہ کر سکے، اور بعد میں جب حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتی رہی تو ہندو مسلم پرامن بقائے باہمی

کا دھیان بھی ذہنوں سے نکل گیا۔ سر سید احمد خان ہندومسلم اتحاد کے قائل اور انھیں دلھن کی دو آنکھوں سے تشبیہ دیتے تھے۔ مگر ان کے باہمی فسادات اور نہ ختم ہونے والی داخلی چپقلش دیکھ کر وہ اس نظریے سے تائب ہو گئے۔ جناح بھی پہلے کانگریس میں رہتے ہوئے ہندومسلم اتحاد کے علم بردار تھے، مگر آخرِ کار وہ بھی دونوں کی الگ الگ قومیت کا اعتقاد رکھنے لگے۔ جناح کے طرزِ بود و ماند کو پسند نہ کرنے والے کانگریس میں شامل 'علماء'، البتہ، دو قومی نظریے کے قائل نہ تھے۔ کچھ نے اس لحاظ سے (قوم) کے اردو میں مستعمل لفظ کی عربی استعمال کے حوالے سے تشریح شروع کر دی، اور تصورِ پاکستان کے مقابل، وطن کو قوم کی بنیاد قرار دیا۔ اس پر اقبال اورحسین احمد مدنی کے درمیان تلخی کا سماں بھی پیدا ہوا۔ کچھ دیگر حضرات نے اپنے 'تاریخی شعور' کی بنیاد پر پاکستان کے قیام کو ضروری قرار نہ دیا، اور اس کی مخالفت کرتے ہوئے سیاست اور دین کی اپنے نقطۂ نظر کے مطابق مخصوص تشریح کی، جسے بعد میں 'علماء' کے ایک تیسرے گروہ نے 'تاویل وتعبیر کی غلطی' قرار دیا۔ البتہ پیرانہ طبقے نے، جسے عوام الناس کی حمایت اور ان میں نفوذ حاصل تھا، قیامِ پاکستان کی تائید کی۔ معلوم نہیں یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں عام طور پر پیرانہ طرز کی تقدیسِ بے جا کا رواج اور راج نظر آتا ہے۔

(۲۸) حاشیہ از مترجم: اس تصویر کشی میں مسلمانوں کے ہاں تشکیل پانے والی بے سرو پا روایات کی دیومالا، قبر پرستی، روحانیات کے نام پر غیر اخلاقی، غیر قانونی بندشوں اور خود پیغمبرؐ کو خدا کا ہم پلہ، بلکہ خدا ہی قرار دینے والے نقطہ ہائے نظر نے بعد میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس سے مستشرقین کو بھی اپنے مطلب کا مخالفانہ مواد میسر آیا اور مغرب میں مسلمانوں کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں میں بھی اضافہ ہوا۔ نیز موجودہ دور میں قبائلی جہالت پر مبنی ''جہادِ باہمی'' یا ''جہاد بالسیف کی نجکاری'' (Privatization of War)، نیز اپنی اپنی شریعت نافذ کرنے کی وجہ سے، مزید غلط فہمی، جو مغربی اقوام ایک طرف، خود مشرق میں عوامی اور تحقیقی سطح پر جہلِ مرکب و جہلِ بسیط بن کر یوں پروان چڑھی کہ صحیح اور غلط کجا، وسیع تناظر میں فائدے اور نقصان تک میں تمیز محال ہو گئی۔ فکر وعمل کی سطح پر ان باتوں کو صاف کرنے کی بجائے 'علماء حضرات' نے معذرت خواہانہ اور حیلہ جو رویہ اپنایا، اور سادہ لوح مسلمانوں کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے پر اکسایا۔ اس سلسلے میں فتوی بازی نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ایک دو مثالیں دیکھیے: ''رنگیلا رسول'' کے مصنف راج گوپال کو عدالت کے ذریعے قرار واقعی سزا دلوانے کی بجائے جذباتی مذہبیت نے ایک سادہ لوح کے ہاتھوں قتل کروایا۔ سلمان رشدی کی "Satanic Verses" میں پیغمبرؐ کے بارے میں توہین آمیز بات کو جذباتیت کی بجائے شروع ہی میں تحقیقی اورعلمی طور پر واضح کیا جا سکتا تھا، اور (فتویٰ بازی، نیز روحانیات کے نام پر "ordeal" کی غیر اخلاقی سزا اور بندشوں کی witchcraft نافذ کرنے کی بجائے) عدالت کے فیصلے کو اہمیت دی جا سکتی تھی۔ اسی طرح نجیب محفوظ کے ناول ''اولاد حارتنا'' کا ایک مخصوص سماجی فلسفے کی ادبی پیشکش کے لحاظ سے فکری اور تنقیدی سطح پر جائزہ لینے کے ساتھ اس کے 'ابراہیمی مذاہب' کے بارے میں نقطۂ نظر کو 'فسادِ خلق' کے ذیل میں رکھتے ہوئے عدالت نے پابندی کا جو فیصلہ دیا، اس کا احترام کیا جا سکتا تھا۔ مگر ایک مولوی صاحب نے ایک سادہ لوح کو، جو اس ناول کے مطالب سے ناواقفِ محض تھا، قانون ہاتھ میں لینے اور مصنف پر قاتلانہ حملے کے لیے اکسایا۔ فتوے بازی اور لوگوں کے جذبات وعقیدت کے استحصال سے مسائل حل ہونے کی بجائے زیادہ سنگین ہوئے، جبکہ واقعی تحقیقی روش کو طنز و ہجو کا نشانہ بنانے سے غلط فہمیاں بھی بڑھیں اور الجھنوں میں بھی تلخی در آئی۔ قادیانیوں کو اگر غیرمسلم قرار دیا گیا تو پہلے عدالت میں جا کر، اور قیامِ پاکستان کے بعد پارلیمنٹ کے ذریعے۔ لیکن ہوا یہ کہ جلسے جلوسوں اور تحریکوں کے ذریعے عوام میں منافرت کی آگ بھڑکائی گئی اور پھر

جوابی اور جواب الجواب برملا و خفیہ ہتھکنڈوں اور دشمنانہ کارروائیوں سے وہ معاشرتی بگاڑ پیدا کیا گیا کہ اب مداوا کرنا مشکل ہو گیا۔ نتیجتاً اُسی "ordeal" کی غیر اخلاقی نگرانی اور خفیہ سزا کا رواج اور witchcraft والی انٹیلی جنس راج ہے۔ اس 'روحانیاتی معنوی اقتدار کے سامنے لوگ بے بس، بلکہ خود مقتدر حضرات محض rubber stamp اور آلۂ کار بنے نظر آتے ہیں۔ مذہب اور روحانیات کے نام پر اور دیگر مقاصد کے حصول کی خاطر خفیہ و برملا انٹیلی جنس کی اسی کند کٹار سے عوام و خواص کو ان کی حیثیت و منصب، کام کار اور نظریات و اصول کے حوالے سے مادی حقیقی یا معنوی نفسیاتی یا ہر دو لحاظ سے ذبح کیا جاتا رہا ہے، اور ہنوز یہ سلسلہ برقرار ہے ۔ رجائی یا قنوطی نقطہ ہائے نظر، بلکہ 'حقیقت پسندی' سے بھی قطعِ نظر، تہذیب و تمدن نے جیسے premitive ages سے ذرا قدم آگے نہیں بڑھایا۔

(۲۹) Christendom vs. Islam: 14 Centuries of Interaction and Co-existance، از R M Savory، شائع شدہ در Introduction to Islamic Civilization، مرتبہ: R M Savory، (لندن، نیویارک، Malbourne، 1976ء)، صفحہ 129۔ حاشیہ از مترجم: یہاں اس حوالے سے کہ 'ترک' اُس وقت دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت تھے، اقبالؔ کا یہ برمحل شعر درج کرنے کو جی چاہتا ہے، جو مسلمان ممالک کی حالتِ زار اور خود ترکوں کی 'یورپی اتحاد' میں شامل ہونے کی بھیک مانگنے پر بے ساختہ ذہن میں ابھرتا ہے: تھے تو آبا ہی تمھارے وہ مگر تم کیا ہو :: ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو ......مسلمان ابھی تک پرانے نشے میں چور اس بات پر فخر و مباہات کا اظہار کرتے نہیں تھکتے کہ یورپ نے سائنسی علوم ہم سے لیے۔ حالانکہ قبل ازیں، مسلمانوں نے یہ علوم دیگر اقوام سے لیے تھے۔ اگر مسلمانوں نے ان پر اضافہ کیا تھا تو مغربی اقوام نے انھیں اب اور آگے بڑھایا ہے۔ ان علوم کی اپنے ہاں منتقلی اور اپنے ماحول اور حالات کے لحاظ سے ان کا اطلاق، نیز ان میں کوئی تازہ کاری انجام دینے کی بجائے مسلمان مردہ پرستی کے 'استخارے' اور 'جہادِ باہمی' کے 'عملِ جاہلیت' میں مصروف یورپ کے 'قرونِ وسطیٰ' میں جیتے نظر آتے ہیں..... یہاں یہ ذکر نامناسب نہ ہو گا کہ جنابِ علی ہجویریؒ کے قُبّے پر ناچنے والے کسی 'من چلے' کے سر میں جانے کیا 'سودا' سمایا کہ ایک خاص نقطۂ نظر کے زیرِ اثر اقبالؔ پر اثر ڈالنے کے لیے ایک خاص موقع پر انھیں 'پیرِ رومی' کا یہ شعر جا سنایا: ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند :: اوّل آں بنیاد را ویراں کنند۔ اس پر اقبالؔ (جو اس وقت مسلم نشاَۃِ ثانیہ کے خواب دیکھ رہے تھے) پر لرزہ طاری ہو گیا...... بہرکیف، ویسے بھی برابری کی سطح پر اثر اندازی و اثر پذیری اور اخذ و عطا کی مثالیں تاریخ میں شاذ ہی ملتی ہیں۔ زیادہ تر یک طرفہ ٹریفک کا رجحان نظر آتا ہے، اور غنیؔ کاشمیری کے اقبالؔ ہی کے تضمین کردہ اس شعر پر تان ٹوٹتی ہے کہ: غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن :: کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را۔

(۳۰) حاشیہ از مترجم: مغرب اور مسلمانوں میں طاقت کے توازن اور ترکوں کی عسکری کامیابیوں کے ساتھ یاد رکھنے اور مسلمانوں کے باہمی داخلی، خاص طور پر شیعہ سنی تعلقات کے سلسلے میں غور طلب بات یہ ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کی افواج نے، 1529ء میں 'ویانا کے محاصرے' سے لے کر 1683ء میں 'جنگِ ویانا' تک، کئی بار ویانا پر قبضہ حاصل کرنا چاہا، اور جب بھی اس بات کا امکان پیدا ہوا، تو دیگر وجوہ کی علاوہ ایک اہم وجہ ایران کی صفوی حکومت کا پیٹھ میں خنجر گھونپنا تھا، جس کے باعث عثمانیوں کو خارجی لڑائی سے توجہ ہٹا کر دوسری طرف صفویوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔

(۳۱) حاشیہ از مترجم: یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ اسرائیل کی ریاست قائم کرنے کا منصوبہ پاکستان کے ایک سابق وزیرِ اعظم ملک فیروز خان نون نے، تقسیمِ ہند سے قبل اپنی لندن میں ہائی کمشنری کے دوران انگریز

کی طرف سے سونپی گئی ایک اسائنمنٹ کے طور پر انجام دیا تھا، اور مجموعی لحاظ سے جس پر عمل کرتے ہوئے اسرائیل کی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ (تفصیل کے لیے لندن سے نکلنے والے Impact International کا اگست 2003ء کا شمارہ دیکھیے)۔

(۳۲) حاشیہ از مترجم: مغرب کے عیسائی ایک طرف، مشرق کے عیسائی بھی اس بے جا طرف داری اور 'الطافِ خسروانہ' کے یکساں طور پر مستحق نظر آتے ہیں۔ استعمار، اپنے زیرِ نگیں ملکوں کو ان کی ظاہری آزادی کا پروانہ عنایت کرتے وقت ان کے ہاں کوئی نہ کوئی 'وجہِ مخاصمت' (bone of contention) ضرور چھوڑ گیا تھا۔ برِّصغیر میں 'مسئلہٗ کشمیر'، ایشیائے کوچک میں 'مسئلہٗ قبرص'، مشرقِ وسطیٰ میں 'اسرائیل و فلسطین کا مسئلہ'، اور انڈونیشیا میں جزیرہٗ تیمور کا مسئلہ۔ ان میں آخر الذکر خاص طور پر عیسائی مسئلہ تھا، جسے بہر طور حل کر لیا گیا۔ اسی طرح اسرائیل کی صیہونی ریاست کو بھی امداد اور تائید حاصل ہوتی ہے۔ باقی مسائل جوں کے توں برقرار ہیں، اور ان کے گردا گرد بہت سے دیگر مسائل خود بخود پیدا ہو گئے۔ نیز 'سرد جنگ' کے بعد وسط ایشیائی مسلم ریاستوں کے مسائل پیدا ہوئے۔ جبکہ موجودہ عالمی صورتِ حال اور اس میں پیدا شدہ تازہ مسائل ان پر اضافہ ہیں۔

(۳۳) حاشیہ از مترجم: یہ آغاز، اس مضمون کی تحریر کے وقت سے لے کر اب تقریباً کوئی دس برس بعد تک اسی طرح آغاز ہی رہا ہے، اور حالات میں بہتری کی بجائے مزید بگاڑ پیدا ہوا، جس کے اسباب تلاشنے کے لیے یقیناً کسی خاص جستجو کی ضرورت نہیں، بلکہ عالمی حالات پر محض ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہے۔

(۳۴) مسلمان تارکینِ وطن، مغرب میں اسلام قبول کرنے والوں اور یورپ و شمالی امریکا میں پیدا ہونے والی مسلمان نسلوں، نیز خود کو مسلمان خیال کرنے والے یا کسی نہ کسی طور اسلام سے منسلک گروہوں کے بارے میں مصادر و مراجع، فزوں تر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں اپنی علمی گہرائی اور باہم پسِ منظر میں مختلف، مگر افادے کے حامل کچھ مصادر یہ ہیں: Muslims in Western Europe، از Jorgen Nielsen، اشاعتِ ثانی (Edinburgh، 1995ء؛ اشاعتِ اول 1992ء)؛ Muslim Minorities in the West، از Syed Z Abedin و Ziauddin Sardar، (لندن، 1995ء)؛ M Ali Kettanis کی کتاب Muslim Minorities in the World Today، (لندن، نیویارک، 1986ء)، اس میں دی گئی معلومات کو تازہ اعداد و شمار کے مطابق درست کر لیا جائے تو مناسب ہو گا؛ اور Muslims in Europe، از Bernard Lewis و Dominique Schnapper، (لندن، 1994ء)۔ برطانیہ کے مسلمانوں کے بارے میں پائے جانے والے مصادر و مراجع، جو پیچھے انیسویں صدی تک پہنچتے ہیں، کے بہترین جائزے کے لیے دیکھیے: Muslims in Britian: A Comprehensive Bibliography، از M Mumtaz Ali، شائع شدہ در Muslim World Book Review 6:2، (1986ء)، صفحہ 51-64۔ Institute of Muslim Minority Affairs کا شش ماہی مجلّہ اسلام کے روایتی خطوں سے باہر مقیم مسلمانوں کے سلسلے میں گفت و شنید کا ایک اہم 'فورم'، نیز ان کے بارے میں معلومات کا ایک اچھا مصدر ہے۔ سیاہ فام مسلمانوں کی اٹھان اور ارتقا سمیت، شمالی امریکا کے مسلمانوں کی تاریخ اور حالات پر دیے گئے مواد کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے اس مجلّے سے یہاں کچھ قابلِ ذکر مصادر درج کیے جاتے ہیں: Neighbors: Muslims in North America، از Elias Mallison، (نیویارک، 1989ء)؛ Islamic Values in the United States: A Contemporary Study، از Yvonne Yazbeck Haddad و Adair T Lummis، (نیویارک، آکسفورڈ، 1987ء)؛ The Muslims of America، مرتبہ:

Yvonne Yazbeck Haddad، (نیویارک، 1991ء)؛ American Islam: Growing Up Muslim in America، از Richard Wormser، (نیویارک، 1994ء)؛ Demographic Characteristics of the American Muslim Community، شائع شدہ در Islamic Studies, 36:1، (1997ء)، صفحہ 57-76۔ سیاہ فام مسلمانوں کو ان کتب میں خاص طور پر زیرِ بحث لایا گیا ہے: Black Nationalism: A Search for Identity in America، از E U Essien-Udom، (نیویارک، 1962ء)؛ The Black Muslims in America، از C Eric Lincoln، (بوسٹن، 1973ء)؛ Message to the Black Man، از Elijah Muhammad، (Chicago، 1965ء)؛ اور Torchlight for America، از Louis Farrakhan، (Chicago، 1993ء)۔ ظفر اسحاق انصاری نے Aespects of 'Black' Muslim Theology، شائع شدہ در Studia Islamica, LIII، (1981ء)، صفحہ 137-176، میں سیاہ فام مسلمانوں کی تحریک سے متعلق عقائدی پہلوؤں کا گہری نظر سے جائزہ لیا ہے۔ Elijah Muhammad کی تعلیمات پر عمل کرنے والوں کی اکثریت کے سنی اسلام کی طرف آنے کے سلسلے میں دیکھیے: اس کے بیٹے Warith Deen Muhammad کی کتاب As the Light Shineth from the East، (Chicago، 1980ء)؛ اور From Black Muslims to Muslims: The Transition from Separatism to Islam, 1930-1980، از Cilfton E Marsh، (Metuchen, N J، لندن، 1984ء)۔ مغرب میں کچھ نو مسلموں نے اپنی بعض تصنیفات میں اپنے اسلام قبول کرنے کی بصیرت آگیں اور واضح صاف انداز میں سرگزشت بیان کی ہے۔ ان میں قابلِ ذکر یہ ہیں: The Road to Mecca، از Muhammad Asad، (Gibraltar)، چوتھا نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن 1980ء؛ پہلا ایڈیشن 1954ء)؛ The Autobiography of Malcolm X، از Malcolm X (Malik El-Shabbaz)، بمعاونت: Alex Haley، (نیویارک، 1964ء)؛ Islam and the Destiny of Man، از Charles Le Gai Eaton، (کیمبرج، 1994ء، اشاعتِ اول 1985ء)؛ Diary of a German Muslim، از Murad Wilfried Hofmann، (Cologne، 1987ء)؛ Hadj: An American Muslim's Pilgrimage to Mecca، از Michael Wolfe، (نیویارک، 1993ء)؛ اور Struggling to Surrender: Some Impressions of An American Convert to Islam، از Jaffery Lang، (Beltsville، Maryland، 1994ء)۔ Peter Clark کی تصنیف Marmaduke Pickthall: British Muslim، (لندن، Melbourne، نیویارک، 1986ء)، ایک برطانوی مسلمان کی پہلی مکمل سوانح حیات ہے، جس نے قرآن ترجمہ کرنے سے پہلے، E M Foster ایسے ادبی نقادوں سے خود کو بطور ناول نگار تسلیم کرایا تھا۔ حاشیہ از مترجم: سنی اسلام اور شیعہ اسلام سے قطع نظر، اس سلسلے میں بانیِ پاکستان محمد علی جناح کا زاویۂ نگاہ پیشِ نظر رکھنا مناسب تر معلوم ہوتا ہے۔ قائدِ اعظم اسماعیلی شیعہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، مگر سنی/ شیعہ یا اثناعشری/ اسماعیلی اور دیگر کسی قسم کی فرقہ پردازانہ یا ملائیت زدہ یا محض اسلام کی ٹھیکیدارانہ ذہنیت سے کوسوں دور تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بلوچستان کے کچھ شیعہ لوگ جناح سے ملنے آئے اور جناح کو اپنا ''مومن بھائی'' کہہ کر طرف داری اور خاص مراعات کا تقاضا کیا۔ اس پر جناح نے انھیں ڈانٹ پلائی اور فرقہ جاتی نقطۂ نظر سے براء ت کا اظہار کیا۔

(۳۵) اس طرح کے لوگوں کی سرگرمیاں مسلم مسیحی روابط کو پختہ کرنے میں گراں قدر اہمیت کی حامل ہیں، کہ اس

سلسلے میں ان کا کام، مغربی اسکالروں کے کردار کے برعکس، وسیع تر عوامی حلقے میں رسائی رکھتا ہے۔ صرف ریاست ہائے متحدۂ امریکا سے منتخب کی گئی مثالیں اس بات کو بڑی حد تک واضح کر دیں گی۔ مسلم ممالک سے واپس اپنے وطن لوٹنے اور اسلام کے بارے میں معروضی معلومات پیش کرنے والے امریکیوں میں سے چند ایک یہ ہیں: Link سے تعلق رکھنے والے John Mahoney اور Robert Norberg، اور Washington Report on Middle East Affairs سے متعلق Richard Curtiss اور Andrew Killgore۔ اسلام کے بارے میں Second Vatican Council کے اعلامیے سے متاثر ہو کر ایک پختہ کیتھولک عقیدے کا حامل آنجہانی William Mulligan، مسلم مخالف امتیازی سلوک اور اسلام کے بارے میں ٹھکے بیٹھے جامد نظریات اور رویوں کے خلاف جنگ کرنے میں سرگرمِ عمل ہوا۔ Missouri سے تعلق رکھنے والے میاں بیوی پر مشتمل ایک 'ٹیم' نے بیشتر اپنے پیسوں سے، اور جوڑے میں سے ایک کی 'طاقت ربا' جسمانی معذوری کے باوجود، اپنی ریاست میں ایک منفرد 'اسلامی میوزیم' قائم کیا۔ اس 'میوزیم' کی سیر دیکھنے کا ایک لائحۂ عمل بھی ہے۔ اس نے ہزاروں طلبہ کو فائدہ پہنچایا، اور یہ اسلام اور مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں سفری نمائشوں کے ذریعے قومی سطح پر معلومات کی ترسیل بھی کرتا ہے۔ بین الثقافتی فہم و افہام کے سلسلے میں Nance کے شرکت دادہ نمایاں حصے کے بارے میں The Nance Museum: A Journey into Traditional Saudi Arabia، از Paul J Nanc، (Lone Jack، Missouri، 1999ء)، پر اسماعیل ابراہیم نوّاب کا تحریر کردہ دیباچہ (صفحہ x-xii)، ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

(۳۶) حاشیہ از مترجم: سینٹ ڈومینیکن (1221ء) سے وابستہ پادری اور چرچ۔

(۳۷) حاشیہ از مترجم: 1210ء میں سینٹ فرانسس آف Assisi کا قائم کردہ مذہبی درویشوں کا سلسلہ اور اس سے متعلق چرچ۔

(۳۸) کیمبرج یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے 1936ء میں لکھے اپنے خط میں عربی پڑھنے کے محرکات بیان کیے ہیں: ''ہم خیال کرتے ہیں کہ یہ کام خود اپنی حیثیت میں نہ صرف اس بہت سے علم کو، جو ابھی تک اس علمی زبان میں بند پڑا ہے، منظرِ عام پر لاکر اچھی ادبیات کو ترقی دینے کی جانب مائل [بہ سفر] نظر آتا ہے، بلکہ ان مشرقی اقوام کے ساتھ ہماری تجارت کے سلسلے میں بادشاہ اور ریاست کی بہتر خدمت کو پروان چڑھانے کا رجحان بھی اپنے اندر رکھتا ہے؛ نیز خدا کے ان بھلے وقتوں میں چرچ کی حدود کو پھیلانے، اور ان لوگوں کے لیے عیسائی مذہب کی تشہیر و تبلیغ کی خاطر بھی عربی سیکھنے کا رجحان پایا جاتا ہے جو، ابھی تک اندھیرے میں بیٹھے ہیں...''؛ اقتباس کردہ در Oriental Essays: Portraits of Seven Scholars، (لندن، 1960ء)، صفحہ 12۔

(۳۹) Stubbe کی کتاب Account of the Rise and Progress of Mahometanism, with the Life of Mahomet and a Vidication of him and his Religion from the Calumnies of the Christians، 1911ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ Bosworth نے اپنے آرٹیکل The Prophet Vindicated: A Restoration Treatise on Islam and Muhammad، شائع شدہ در Religion: Journal of Religion and Relations, 6:1، (Spring، 1976ء)، صفحہ 1-12، میں قائین کے وسیع تر حلقے کی توجہ Stubbe کے کام کی طرف مبذول کی۔

(۴۰) یہ Humphrey Prideaux (جو ایک انگریز پادری اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں عبرانی پڑھایا کرتا تھا، اور بعدازاں Norwich کا پرنسپل بنا) کی سب سے مشہور تصنیف ہے ۔ یہ کتاب 1697ء میں شائع ہوئی۔ اس کی بارہا اشاعتِ مکرر عمل میں آئی، اور اس کا دیگر یورپی زبانوں میں ترجمہ بھی کیا گیا۔ یہ کتاب جزوی طور پر Stubbe کے مذکورہ کام کا ردِعمل بھی ہو سکتی ہے، لیکن اس کی گردش خواہ مسودے کی نقول کی صورت میں دست بدست رہی ہو، اس نے کچھ نہ کچھ مقبولیت ضرور حاصل کر لی تھی۔ Prideaux کے بارے میں دیکھیے: The treatment of Arab History by Prideaux, Ockley and Sale، از P M Holt، شائع شدہ در Historians of the Middle East، مرتبہ: Bernard Lewis و P M Holt، (لندن، 1962ء)، صفحہ 290-302۔

(۴۱) ان پیش رس تعلیمی ماہرین اور اسکالروں میں، جو معروضیت نہ سہی مگر ہمیشہ اپنی علمیت کے باعث نمایاں رہے، چند ایک کا ذکر یہاں ضرور کیا جا سکتا ہے: Thomas Bedwell، (1563-1632ء)؛ Edward Pocock, the Elder، (1604-1691ء)؛ Johann Reiske، (1716-1774ء)؛ William Jones، (1746-1794ء)؛ Sylvestre de Sacy، (1758-1838ء)؛ Joseph von Hammer-Purgstall، (1774-1856ء)؛ Friedrich Ruckert، (1788-1866ء)؛ Reinhart Dozy، (1820-1883ء)؛ Gustav Weil، (1808-1889ء)؛ Ferdinand Wustenfeld، (1808-1899ء)؛ Jan de Goeje، (1866-1906ء)؛ Ignaz Goldziher، (1850-1921ء)؛ Edward Browne، (1862-1926ء)؛ Theodor Noldeke، (1836-1930ء)؛ Leone Caetani، (1869-1935ء)؛ اور Christiaan Snouck Hurgronje، (1857-1936ء)۔

(۴۲) حاشیہ از مترجم: یہ الگ بات ہے کہ خود طبری مسلمانوں کے داخلی تعصّبات کا شکار اور انھیں ہوا دینے کا باعث بنے۔ اس پر کم ہی کسی مشرقی یا مغربی محقق نے نظر ڈالی۔ تمنا عمادی (جنھوں نے اقبال کے کہنے پر 'صحیح بخاری' کی نزولِ مسیح والی روایات پر خود محدثین کے 'روایت و درایت' کے اصولوں کے لحاظ سے تنقیدی نظر ڈال کر انھیں بے اصل ثابت کیا) نے طبری اور اس کی تاریخ کے بارے میں ایک مفصل مضمون بھی تحریر کیا تھا، جس میں طبری کی مشہور کی گئی شیعہ سنی دو حیثیتوں کا پردہ چاک کیا، اور طبری کو تعصب پر مبنی نیز بے اصل اور دیومالائی روایات اپنی تاریخ میں پیش کرنے والا مؤرخ ثابت کیا۔

(۴۳) حاشیہ از مترجم: مستشرقین کے مشرقی شاگردوں کی دلچسپیاں، البتہ، بہت کم وسعت کی حامل رہیں، اور اگر رہیں بھی تو انھیں بیشتر مادی و معنوی بندشوں سامنا رہا۔ محمود شیرانی کی تاریخی، لسانی و ادبی، اور مسکوکات و منقوشات، نیز مخطوطات کے حوالے سے دلچسپیاں (اقبال کی سفارش کے باوجود) خود انگریز کی جانب سے ملازمت میں توسیع نہ دینے کے باعث تقریباً ختم ہو کر رہ گئیں، اور موصوف کو اپنے نادر مسکوکات، پنجاب یونیورسٹی کی طرف مناسب قیمت ادا نہ کرنے پر، ایک ہندو سیٹھ کے ہاتھ بیچ کر اپنے وطنِ مالوف ٹونک لوٹنا پڑا۔ کتب و مخطوطات کے ذخیرے کو، البتہ، یونیورسٹی نے خرید لیا، لیکن یہ ذخیرہ وہاں کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وسیع علمی دلچسپیوں کے حامل چند بچے کھچے لوگوں میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کا نام بھی آتا ہے۔ مجلسِ ترقیِ ادب کے شائع کردہ 'مقالاتِ شیرانی' کی طرح مقالاتِ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، قطعِ نظر ان کی عام اہمیت کے، آپ کی وسیع تر دلچسپیوں کے شاہد ہیں۔ اسی طرح ان کی خدمت میں پیش کیے

گئے علمی مقالات معنون بہ 'ارمغانِ شفیع'، نیز اردو کے پہلے جامع انسائیکلوپیڈیا 'دائرۂ معارف اردو' کی ادارت سے بھی آپ کی علمی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ موصوف کو مادی و معنوی بندشوں کا شکار بنایا گیا تھا، جس کی وجہ سے موصوف اپنے حلقے کے چند ایک لوگوں کے علاوہ کسی سے بات تک نہیں کیا کرتے تھے۔ موصوف کے شاگرد اور ڈاکٹریٹ کی دو ڈگریاں رکھنے والے ڈاکٹر رانا محمد نصراللہ احسان الٰہی بھی ایسی ہی بندشوں کا شکار بنے، اور 'جوگی' کا لقب پا کر تصوف کے نقشبندی سلسلے سے منسلک ہوئے۔ صرف انھی کے لیے ملازمت کی ترقی میں یہ شرط لگائی گئی کہ عرب ممالک میں معینہ مدت گزار کر آئ۔ واضح رہے کہ موصوف کو یمن کے تاریخی آثار و منقوشات کے سلسلے میں مستشرقین کی اغلاط درست کرنے کا شرف بھی حاصل ہے۔ مستشرقین مختلف جگہوں پر جا کر field research بھی کیا کرتے تھے۔ مگر ہمارے ہاں ان کے شاگرد معلوم نہیں اپنی 'انانیت' کی وجہ سے یا مخصوص بندشوں کے باعث اس 'میدانی تحقیق' سے عاری ہیں۔ اسی بات پر نقاد مظفر علی سید کو بجا طور گلہ ہوا تھا کہ مستشرقین کے مشرقی شاگردوں نے دفتروں میں بیٹھ کر انتظامی ہتھکنڈے اپنانے اور رعب جمانے کے علاوہ شاید ہی علمی پائے کا کوئی کام انجام دیا ہو۔

(۴۴) حاشیہ از مترجم: اس میں خالص تجارتی نقطۂ نظر کے ساتھ بعض علماء کے اس فتوے کو بھی دخل ہے کہ کتابوں کی چوری جائز ہے۔

(۴۵) محض ایک مثال دینے کی خاطر کہ صاف ذہن مستشرقین کس طرح 'اسلامیات' کے بارے میں اپنے ہم منصبوں کے تعصب اور اغلاط کو رد کرتے ہیں، The Jewish Foundation of Islam، از Carles Cutler Torrey، (نیویارک، بارِ مکرر 1967ء؛ اشاعتِ اول 1933ء)، پر Franz Rozenthal کا انتہائی علمی اور حساس مسائل کو مناسب طور پر زیرِ بحث لانے والا تعارف (صفحہ v-xxiii) ملاحظہ کیجیے۔ Rosenthal، Torrey کی کچھ اغلاط کی تصحیح، اور اس کے طریقۂ تحقیق پر تنقید کرتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ لکھتا ہے (صفحہ viii): ''جب وہ [Torrey] ان نقاط کی طرف آتا ہے جن کا بطور دلیل خود اس کے 'اسلام کی یہودی اساس' والے نظریے کے خلاف استعمال کا امکان ہو سکتا ہے، تو اس کی عمومی طور پر نظر آنے والی معروضیت اور علمی برداشت کچھ کمزور پڑ جاتی ہے، اور وہ ثبوت کے 'دشوار گرفتنی' ہونے (obstreperousness) سے قدرے نالاں ہونے کا تأثر دیتا ہے''۔ نیز Rosenthal لکھتا ہے (صفحہ xxii): ''Torrey کے کام کا معتد بہ حصہ ایسا ہے جو بحث و مناقشہ کے قابل، بلکہ غلط ہے۔ یہ 'اسلامی تحقیق' کے رائج انداز میں شمار نہیں ہو سکتا، اور آج کے بہت سے 'ماہرینِ اسلامیات' (Islamists) اس کام کے طریقۂ کار اور تکنیک پر کوئی ردِعمل نہیں دے سکتے''۔ حاشیہ از مترجم: مستشرقین کے الزامات درست ہوں یا نہیں، یہ بات واضح ہے کہ انھیں خود مسلمانوں کی داخلی طور پر بنائی اور اپنائی ہوئی دیومالائی روایات اور تشریحات سے سہارا ملتا ہے۔ یہاں مسلمانوں کے لیے قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان کے ہاں اگر کسی نے 'اب و جدٔ' کے ٹھکے بیٹھے جامد نظریات پر از روئے تحقیق، تنقیدی نظر ڈالی تو وہ اس پر تکفیر و تفسیق کے فتوے لگانے یا اسے تفرقہ پرداز اور زندیق قرار دینے لگتے ہیں۔ قدما میں اس کی مثال ابوحیان توحیدی کی ہے، جس کے علمی نظریات، تشریحات اور کبھی، بطور ردِعمل، تیز ہو جانے والے لہجے کی بنا پر موصوف کو ابن الراوندی کے ساتھ 'زنادقہ' کے زمرے میں ڈال دیا گیا۔ برِصغیر میں دیگر تحقیقی و تنقیدی تصحیح کاروں کے ساتھ ایک کم معروف نام عبداللہ عمادی کا بھی ہے۔ بعض قرآنی مطالب کے سلسلے میں ان کے تحقیقی مضامین کے ایک مجموعے ''محکمات'' پر پیش لفظ لکھتے ہوئے جنابِ سلیمان ندوی نے اپنی تمام تر علمیت اور زبان دانی و تاریخ دانی کے باوصف عبداللہ عمادی کی آرا کو (خواہ اصطلاحی لحاظ سے) 'شاذ' قرار دے کر قاری کی نظر سے گرانا چاہا۔ حالانکہ لسانی اور داخلی، نیز خارجی

قرائن کے اعتبار سے وہ آرا درست اور صائب ہیں۔ معلوم نہیں یہ معاصرانہ چشمک کی کارفرمائی ہے یا 'سخن ہائے گفتنی' کو بے وجہ کے 'خوفِ فسادِ خلق' سے 'ناگفتنی' قرار دینے والے نام نہاد مصلحت کے حامل رویے کا پرتو، کہ اچھی بھلی عقل و فہم اور تاریخ و قرائن پر مبنی تحقیقی آراء و نقطہ ہائے نظر کو ختم کرنے یا دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غالباً اسی بات پر ظفر علی خاں نے شعر کے پیرائے میں طنزاً کہا تھا: نکل جاتی ہو سچّی بات جس کے منہ سے مستی میں :: فقیہِ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا۔

(۴۶) قرآن، المائدہ: 8، ﴿ولا يجرمنكم شنآن قوم على ألا تعدلوا﴾

(۴۷) قرآن، الاِسراء: 15، ﴿.... ولا تزر وازرة وزر أخرى﴾۔ یہ اسلامی عقیدہ کہ 'ہر کوئی صرف اور صرف اپنے اعمال کا جواب دہ ہے'، قرآن میں بارہا مکرر آیا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے: الانعام: 164؛ فاطر: 18؛ الزمر: 7؛ اور النجم: 38۔

(۴۸) حاشیہ از مترجم: لارڈ کرومر نے مصر کے ایک پورے دیہات کو اس کی عورتوں، بچوں، بوڑھوں سمیت اپنی استعماری بربریت کا نشانہ بنایا۔ لارڈ کرومر کی اس ظالمانہ غارت گری پر مصر کے عظیم شاعر احمد شوقی نے شعری اشک بہا کر بے رس خشک تاریخ کے متوازی انسانی جذبات کی حامل زندہ و متحرک تاریخ بھی رقم کی۔ یہ واقعہ قیامِ پاکستان سے قبل امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں پیش آنے والے اسی برطانوی استعمار کی بربریت کے مظاہرے سے مشابہ ہے۔

(۴۹) اسلام کے مستشرق ماہرین کے بارے میں ان کے حامیوں اور مخالفین کی نمائندگی کرنے والا بہت سا اور فزوں تر مقدار میں مواد پایا جاتا ہے۔ یہ مواد اہمیت اور صاف ذہنی کے مختلف درجوں کا حامل ہے، اگرچہ مسلمانوں (جن میں بیشتر مغرب سے یا مسلم دنیا میں موجود مغربی طرز کی یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ ہیں) کا حالیہ سالوں میں پیداکردہ لٹریچر بسا اوقات انتہائی تنقیدی رہا ہے۔ مسلم اسکالر، مستشرقین کی ایک ایسے میدان میں تفوق حاصل کرنے کے لیے کی گئی انتہائی سخت محنت کا اعتراف کرتے ہیں جو ان کے ثقافتی ماحول اور تہذیبی پسِ منظر (orientation) سے مغائر ہے۔ وہ ان کی اعلیٰ تعلیمی کامیابیوں پر خوشی اور تائید کا اظہار اور 'اسلامیات' کے بہت سے شعبوں میں ان کے متأثر کن حصے کی تعریف و تحسین کرتے ہیں۔ تاہم، اس کے ساتھ وہ اکثر اپنے مغربی ہمکاروں کو اس بات پر ملامت و تنبیہ کرتے نظر آتے ہیں جسے مسلمان، مستشرقین کی جانب دارانہ پیشکش، غیر مصنّون تشریحات، بے جواز و دلیل نتائج، خشک و بے مغز اور نسلیت و انانیت پرستی پر مبنی طریقۂ تحقیق کا نام دیتے ہیں۔ نیز کبھی وہ انھیں ان کی فاحش لسانی یا دیگر واقعاتی اغلاط پر زجر و ملامت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جدید معاصر دور کا ایک مشہور اسکالر (جو دمشق کی 'عرب اکادمی' کا بانی ہے) کی طرف سے مستشرقین کے عرب دنیا کی ادبی اور ثقافتی نشأتِ ثانیہ میں ڈالے حصے پر عربوں کے انتہائی منّت پذیر ہونے کے اعتراف کے لیے دیکھیے: 'مجلۃ المجمع العلمی العربی' 7، (1927ء)، صفحہ 400۔ تقابل کی خاطر، نیز مستشرقین کے انداختہ قابلِ تعریف حصہ و کردار، اور اپنے غیر تنقیدی مسلمان شاگردوں پر ان کے ضرر رساں اثر کی جانچ اور محاکمہ کے لیے راقم السطور کا مقالہ بعنوان: Reflections on the Roles and Educational Desiderata of the Islamist، از Isma'il Ibrahim Nawwab، شائع شدہ در Islamic Perspectives: Studies in Honour of Sayyid Abul A'la Mawdudi، مرتبہ: Khurshid Ahmad و Zafar Ishaq Ansari، (Leicester، 1979ء)، صفحہ 44، ملاحظہ کیجیے۔ 'استشراق' کو ان دنوں اعلی تعلیمی اداروں میں ایک معیّن شعبے کے طور پر خاصی اہمیت دی گئی ہے۔ یہ

میدان اتنا وسیع ہے کہ مستشرقین کے بارے میں اب نہ صرف عمومی نوعیت کے جائزے، بلکہ کسی خاص اسکالر اور اس کے کام کے بہت سے بصیرت آگیں، مفصل مطالعہ جات، یا اسلام کے مغربی اسکالروں کے مطالعہ کردہ معیّنہ شعبوں میں ان کے بنیادی نقطۂ نظر کے عمیق تجزیے بھی پائے جاتے ہیں۔

(۵۰) 'Carlyle اور پیغمبرِ اسلام' کے لیے دیکھیے: "The Hero as Prophet"، اس کے Edinburgh میں 1840ء میں عوامی اجتماع میں دیے گئے 'لیکچر' کا متن، جو اس کی کتاب On Heroes, Hero-Worship and the Heroic in History، اشاعتِ اول (لندن، 1841ء؛ بارہا اشاعتِ مکرر)؛ Carlyle, Goethe and Muhammad، از Bernard E Dold، (1984ء؛ Edizioni Dott. Antonino Sfameni)، تبصرہ کردہ از M M Ahsan در Islam and Orientalism: Some Critique، شائع شدہ در Muslim World Book Review, 6:2، (Winter 1986ء)، صفحہ 5-6۔ اس فکری اور سماجی پسِ منظر کی، (جو پیغمبرِ اسلام پر Carlyle کی رزمیہ انداز کی حامل تقریر کا باعث بنا)، بہتر تنقید و تحسین کے لیے Edwald Flugel کی کتاب Thomas Carlyle's Moral and Religious Development، ، ترجمہ کردہ از Jessica Gilbert Tyler، پہلی بار شائع شدہ در سال 1891ء، (اشاعتِ مکرر، نیویارک، 1971ء)، مفیدِ مطلب ہے۔ اسکاٹ لینڈ کے اس مؤرخ اور مضمون نگار کی تقریر The Hero as Prophet پر خاص رائے کے لیے دیکھیے: Norman Deniel کا اپنی کتاب Islam and the West: the Making of an Image، از اشاعتِ اول (Edinburgh، 1960ء)، نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن (آکسفورڈ، 1993ء، نیز اس نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن کی آکسفورڈ پیپر بیک اشاعت، 1997ء)، صفحہ 313-314، میں Carlyle کے بارے میں تبصرہ و تنقید؛ What is Islam?، از W Montgomery Watt، (لندن اور بیروت، 1968ء)، صفحہ 1-2، 5-6؛ Islam and the Philosophers of History، از Albert Hourani، شائع شدہ در Europe and the Middle East، (Berkeley اور Los Angeles، 1980ء)، صفحہ 64-65؛ اور Modern Biographies of the Life [sic] of the Prophet Muhammad، از Antonie Wessels، شائع شدہ در Islamic Culture, xlix:2، (اپریل، 1975ء)، صفحہ 99-105، خاص طور پر Carlyle کی تقریر کے مسلم دنیا پر اثر اور سید احمد خان کے ساتھ Carlyle کی گفتگو پر مصنف کے ملاحظہ جات۔

(۵۱) Muhammad: A Bioraphy of the Prophet، از Karen Armstrong، (نیویارک، 1992ء)۔

(۵۲) Islam and the West: The Making of an Image، از Norman Daniel، نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن، صفحہ 326۔

(۵۳) حاشیہ از مترجم: 'مسیح کو مسیح کی تاریخی حیثیت میں تلاش کرنے' کے مقابل یا اس کے متوازی مسلمانوں کے لیے بے لاگ انداز میں پیغمبرِ اسلام کو خود ان کی تاریخی حیثیت میں تلاش کرنے کی اشد ضرورت ہے، تاکہ دیومالائی تاریخی و مذہبی روایات کی دھند سے پیغمبر محمدؐ کا اصل روپ سامنے آ سکے، اور مسلمانوں کی ''اندھی رومانوی عقیدت'' کا مداوا ہو سکے، نیز مستشرقین یا ان ہم خیال 'مستغربین' کے اٹھائے اعتراضات کا غیر معذرت خواہانہ جواب مل سکے۔ (ضمناً:) مسیحؑ کی زندگی کے آخری بارہ گھنٹوں پر Mel Gibson کی ہدایت

کردہ ایک فلم "the Passion of Christ" میں بھی مسیح کو مسیح کی تاریخی حیثیت میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی، جس پر عیسائی مذہبی (خاص طور پر یہودی اثرات کے حامل) حلقوں میں خاصا واویلا بھی مچا۔ اس فلم میں تحقیقی رویے کی حامل تحریروں سے مواد اخذ کیا گیا ہے۔

(۵۴) محض ایک مثال دینے کی خاطر کہ مسیح کی تاریخی حیثیت کے بارے میں تشکیک کی رو کس قدر شدید تھی، The Quest of the Historical Jesus، از Albert Schweitzer، (نیویارک، 1968ء، 1906ء کے اصل جرمن ایڈیشن سے اولین بار ترجمہ کردہ از W Montgomery، 1910ء)، میں Bruno Bauer پر تحریر کردہ باب (نمبر XI، صفحہ 137-160) ملاحظہ کیجیے۔ Bauer نے واضح کرنے کی کوشش کی کہ یہ ثابت کرنا ناممکن ہے کہ مسیح کا بطور ایک تاریخی شخصیت کبھی وجود پایا جاتا تھا۔ بطور ایک نئی صنفِ مطالعہ، ''حیاتِ مسیح کی تاریخ'' پر تصنیف کردہ بہت سی کتابوں میں Schweitzer کا یہ نمایاں نظر آنے والا کام مسیح کے بارے میں پائے جانے والے سوانحی مواد کے ارتقا کی بہترین توضیح کرتا ہے۔ یہ واضح کرتا ہے کہ 'روشن خیالی' کا عہد شروع ہونے کے بعد کس طرح مغربی اسکالروں نے 'مسیح کا قصۂ حیات' ازسرِ نوتشکیل دینے کے لیے اٹھارویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی تک پروان چڑھنے والے طریقہ ہائے تحقیق کو انجیلوں میں پائے جانے والے بنیادی مصدری مواد پر منطبق کیا۔ یہ اس نئی صنفِ مطالعہ (''حیاتِ مسیح کی تاریخ'') کا نشووارتقا تھا جو پیغمبر کی زندگی کو اس مقام سے کھنگالنے کے لیے، بسا اوقات نا مناسب طور پر، استعمال میں لائے گئے طریقہ ہائے تحقیق کا اولین لحاظ سے جواب دہ تھا، جہاں مصدری مواد بے تحاشا اختلاف کا حامل ہے۔ ایک اہم تصنیف فرانسیسی زبان میں 1935ء میں سامنے آئی، اور یوں (مؤخر ہونے کے لحاظ سے) Schweitzer کی کتاب میں اس کا تجزیہ نہیں کیا گیا۔ یہ مسیح کے بارے میں Renanian روایت کا تتبع کرنے والی تحریروں میں سے ہے: The Jewish World in the Time of Jesus، از Charles Guigenbert، مع پیش لفظ از Charles Francis Potter، (نیویارک، 1986ء، اشاعتِ چہارم؛ اشاعتِ اول، 1959ء)۔ مسیح کی مختلف زمانوں کے دوران نشو و ارتقا پانے والی تصویر کے بارے میں ایک نہایت قابلِ خواندنی کتاب یہ ہے: Jesus Throughout the Centuries: His Place in the History of Culture، از Jaroslav Pelikan، (New Haven اور لندن، 1985ء)۔

(۵۵) حاشیہ از مترجم: یہی بات انجیل اور دیگر صحائف پر منطبق آتی ہے۔ بائبل کے تسلیم شدہ مقبولِ عام ایڈیشن میں 'عہد نامۂ جدید' کی چار منتخب کردہ 'معیاری' انجیلیں: متّی، مرقس، لوقا اور یوحنا، اپنے ابتدائی بیان کرنے والوں کے نام پر ہیں، اور داخلی اختلافات کی حامل۔ بے شمار باہم متخالف و متضاد نسخوں میں سے انجیل کے یہ چار نسخے انتخاب کرنے کا جو طریقۂ کار اختیار کیا گیا، وہ غیبی فال نکال سے مشابہ تھا، جو تحقیق و تثبیت یا صحتِ متن جانچنے کے طریقوں سے دور کا علاقہ نہیں رکھتا۔ دوسری طرف مسلمانوں کے ہاں بھی قرآن کے سلسلے میں اختلافی قراء ات کا چرچا کیا گیا، جو سات سے دس تک شمار کی جاتی ہیں۔ ان قراء ات سے بے شمار اختلافی مسائل نے جنم لیا۔ یہ قراء ات محض ادائیگی میں اختلاف کو ظاہر نہیں کرتیں، بلکہ اعراب، الفاظ اور جملوں کے اختلافات پر مشتمل ہیں، جس سے مفہوم کہیں سے کہیں جا پڑتا ہے۔ معیاری یا رائج قراء ت ''حفص کی قراء ت'' کہی جاتی ہے، جس کے مطابق قرآن شائع ہوتا اور بالعموم اسی طرح پڑھا جاتا ہے۔ البتہ، مختلف اشاعتوں میں بعض اوقات آیات کے نمبروں میں اختلاف ضرور واقع ہوا۔ علاوہ بریں، سورۂ فاتحہ، جو فی الواقع چھے آیات پر مشتمل اور اسی طرح مندرج ہوتی ہے، اسے پیغمبرؐ سے منسوب ایک روایت کے تحت

''سبع مثانی'' (یعنی دہرائی جانے والی سات آیات) بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن کے روایت کے ساتھ اس اختلاف کو ختم کرنے کے لیے کئی اشاعتوں میں یہ طریقہ اپنایا گیا کہ اس سورت کی ایک آیت کو ضمنی انداز میں قطع کر کے اس کے اوپر نشان ڈال دیا جاتا ہے۔ (اقبال کا یہ شعر فکری اغلاط کے علاوہ سیاق و قرائن، نیز عقل و فہم کو تج کر روایات کا سہارا لینے والے اِس رویے پر بھی منطبق آتا ہے: خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں :: ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق)۔ ان قرائتوں اور روایتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، قرآن کا معیاری نسخہ، جو خود پیغمبرؐ نے املا کروایا، اور پیغمبر کے جانشینوں (جو جامعینِ قرآن نہیں، بلکہ 'ناشرینِ قرآن' اور انفرادی حافظے یا کتابت کی بنا پر جنم لینے والی اختلافی روایات کو ختم کرنے والے تھے) نے اس نسخے کے مطابق دیگر نسخہ جات باقاعدہ کتابت کروا کے مختلف صوبائی ریاستوں کے دارالحکومتوں میں بھجوائے، تا کہ پڑھنے اور مفہوم میں اختلاف راہ نہ پائے؛ یہ معیاری نسخہ جات اور ان کے مطابق جو مزید کتابت اور پھر اشاعتیں عمل میں آئیں، ان میں سے کسی میں ایک آدھ لفظ کی کتابت میں 'تصحیف' کا ثبوت ملتا ہے۔ ورنہ شروع سے لے کر آج تک قرآن کے بنیادی نسخے میں کوئی اختلاف اور فرق نہیں پایا جاتا۔ اختلافی قراء ات اور ان پر مشتمل روایات قرآن کے داخلی اور خارجی تاریخی قرائن کی رو سے غلط ثابت ہوتی ہیں۔ اہلِ تشیع کے واقعی تحقیقی نظر کے مالک علماء بھی قرآن کے ایک اور مصئون عن التحریف ہونے کے قائل ہیں۔

(۵۶) حاشیہ از مترجم: اس سلسلے میں دیومالائی اسرائیلی روایات اور پیغمبرِ اسلامؐ سے منسوب کیے گئے اسی نوعیت کے کچھ اقوال اور دیگر منسلک باتوں نے بھی اہم کردار ادا کیا، اور ان سے قرآن کی تشریح میں بھی کام لیا گیا، جس سے، قراء ات کی طرح، معنی و مفہوم میں بعض اوقات بنیادی نوعیت کی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ ان اسرائیلی اور دیگر روایات کی اصل تاریخی حیثیت اور سچ کو جھوٹ الگ کرنے پر کم ہی توجہ دی گئی۔ ورنہ اسلام، عیسائیت اور یہودیت، تینوں آسمانی مذاہب کا باہم اشتراک اور ان کی اپنی اپنی علٰیحدہ حیثیت واضح ہونے سے ان میں رواداری، ہم آہنگی اور پرامن بقائے باہمی کا تصور عملی سطح پر ضرور کسی حد تک رواج پاتا۔

(۵۷) حاشیہ از مترجم: فلسطین کے علاقے 'سامرہ' سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے قدیم مذہبی اعتقادات کا مجموعہ۔

(۵۸) اسلام کی مزعومہ یہودی اور عیسائی اصل (origins) پر تصنیف شدہ کچھ کتابوں کے مجرد عنوان ہی ان کے مطالب کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ جیسے یہ کتابیں ہیں: Richard Bell کی The Origin of Islam in its Christian Environment، (لندن، 1926ء)؛ Charles Cutler Torrey کی The Jewish Foundation of Islam، مع تعارف از Franz Rosenthal، (نیویارک، 1967ء؛ اشاعتِ اول، 1933ء)؛ اور Abraham I Katsh کی Judaism in Islam: Biblical and Talmudic Backgrounds of the Koran and its Commentries، (نیویارک، 1954ء)۔ اس بے بنیاد ادّعا کے لیے کہ اسلام نے ''سامریت'' (Samaritanism) سے باتیں مستعار لی ہیں، ملاحظہ کیجیے: Jewish, Christian, and Samaritan Influence on Arabia، از Joshua Finkel، شائع شدہ در The Macdonald Presentation Volume، (Princeton، لندن، آکسفورڈ، 1933ء)، صفحہ 145-166۔ Finkel دریافت کرتا ہے (صفحہ 160): ''مگر کیا ہم جزیرہ نما ے عرب میں پیغمبرِ اسلام کے عہد سے پہلے اور اس دوران 'سامریت' کا وجود پیشگی فرض کرنے کے لیے کافی ثبوت رکھتے ہیں؟ 'سامریوں' کے وہاں بسنے کے متعلق ہمیں کوئی شنید نہیں''۔ لیکن بے خوفِ چیزے، Finkel اسی صفحے پر حزم و اصرار سے یہ بھی کہتا ہے: ''...چنانچہ، اسلام کی پیدائش میں [شریک عوامل میں] 'سامریت' کے حصے کا دعویٰ

کرنا معقول معلوم ہوتا ہے''۔

(۵۹) حاشیہ از مترجم: Geoffrey Chaucer کی مشہور Canterbury Tales کی ایک کہانی کا مرکزی کردار۔

(۶۰) حاشیہ از مترجم: یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ پیغمبرِ اسلامؐ، صرف پیغمبر ہونے کے ناتے انتظامیہ، مقننہ، عدلیہ اور فوج کی سربراہی کے تنہا، مگر شورائی انداز کے مالک تھے، جسے موجودہ دور میں ایک نظامِ کار اور ضابطے کے تحت ہی چلایا جا سکتا ہے، اسلام نافذ کرنے یا اسلامیانے (Islamization) کے زعم میں پیغمبر کی بعینہٖ نقل نہیں کی جا سکتی۔

(۶۱) مغرب میں مستشرقین کے ہاتھوں تشکیل پانے والی پیغمبرِ اسلام کی صورت گری کا ایک کتابیاتی جائزہ محمد ماہر حمادہ (Hamadeh) کے پی ایچ ڈی کے تھیسس کا موضوع ہے، جو قدرے تبدیل شدہ صورت میں اس نام سے شائع ہوا: **مراجع مختارة عن حياة محمد رسول الله**۔ جزء اول: **كتابة السيرة النبوية بين الشرق والغرب من أقدم العصور حتى الوقت الحاضر**، (ریاض، 1982ء)۔ اس کتاب کو افادے میں تسلسل کی غرض سے تازہ اعداد و شمار اور مطالعہ جات کے جائزے سے مزین کرنا ضروری ہے۔ زیادہ قریب کے حالیہ عرصے میں Jabal Muhammad Buaben نے Image of the Prophet Muhammad in the West: A Study of Muir, Margoliuoth and Watt، (Leicester، 1996ء)، میں پیغمبرِ اسلام کے تین نمایاں مغربی سوانح نگاروں کے جائزے پر توجہ مرکوز کی ہے۔ پیغمبرِ اسلام کے سوانحی مطالعہ جات کے بارے میں مغربی نقطۂ نظر کے لیے دیکھیے: Recent European Research on the Life and Work of Prophet Muhammad، از Rudi Paret، شائع شدہ در Journal of the Pakistan Historical Siciety, 6، (1958ء)، صفحہ 81-96؛ اور ACritical Survey of Modern Studies of Muhammad، از Maxime Rodinson، شائع شدہ در Studies on Islam، از M L Swartz، (نیویارک اور آکسفورڈ، 1981ء)، صفحہ 23-85، ترجمہ کردہ از Swartz، مع شان دار انداز سے تشریحی حواشی کے ساتھ مزین ایک تنقیدی کتابیات، از Bilan des etudes mohammediennes'، شائع شدہ در Revue Historique, 229، (1963ء)، صفحہ 169-220۔ پیغمبرِ اسلام کے بارے میں صاف ذہن مستشرقین کا رویہ کچھ عرصہ سے زیادہ معروضی اور ہمدردانہ ہو چکا ہے۔ یہ بات حال ہی میں شائع ہونے والے کچھ تحقیقی مواد میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ پیغمبرِ اسلام اور ان کی محترم حیثیت، نیز مسلم معاشرے میں ان کی مقبول تصویرکشی کے سلسلے میں مسلمان دانشوران کے خیالات پیش کرنے والے تحقیقی کام کے لیے ملاحظہ کیجیے Annemarie Scimmel کی انتہائی اصالت کی حامل تصنیف And Muhammad is His Messenger: The Veneration of the Prophet in Islamic Piety، (Chapel Hill اور لندن، 1985ء؛ اصل جرمن ایڈیشن Und Muhammad Ist Sein Prophet، 1981ء میں Dusseldorf/Koln سے شائع ہوا)۔ نیز دیکھیے اسی مصنفہ کا مقالہ The Prophet Muhammad as a Centre of Muslim Life and Thought، شائع شدہ در We Believe in One God: The Experience of God in Christianity and Islam، مرتبہ: A Schimmel و Falaturi (عبدالجواد) Abdoldjavad، (لندن، 1979ء)، صفحہ 35-61۔

(۲۲) At Sundry Times، (لندن، 1958ء)، صفحہ 27۔

(۲۳) Muhammad's Mecca: History in the Qur'an، (Edinburgh، 1988ء)، صفحہ 1۔

(۲۴) قرآن، آل عمران: 64 : ''کہو، اے 'اہلِ کتاب'! اب آؤ، ہمارے اور اپنے درمیان ایک معاہدہ طے کرو، کہ ہم ایک خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے، اور یہ کہ ہم اس کے علاوہ کسی سے تعلق نہیں رکھیں گے، نیز یہ کہ ہم میں سے کوئی خدا کے ساتھ دوسروں کو آقا نہیں سمجھے گا...''۔ ﴿قل یأهل الکتاب، تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم ألا نعبد إلا الله ولا نشرک به شیئا، ولا یتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله....﴾

(۲۵) Nostra Aetate چرچ اور غیر مسیحی مذاہب، خاص طور پر اسلام کے درمیان تعلقات کے بارے میں ایک اعلامیہ تھا۔ اس کا رسمی عنوان یہ ہے: Declaration on the Relationship of the Church to Non-Christian Religions۔

(۲۶) Nostra Aetate صراحت کرتا ہے: ''چرچ مسلمانوں کو بھی نہایت احترام دیتا ہے۔ وہ [ایسے] خدا کی عبادت کرتے ہیں، جو ایک ہے، زندہ اور قائم [بالذات ہے]، رحم کرنے والا اور مطلق اقتدار کا حامل ہے، آسمان اور زمین کا خالق ہے، اور جس نے انسانوں سے کلام بھی کیا ہے۔ وہ خدا کے پوشیدہ [حاملِ اسرار] احکام کے سامنے بغیر کسی تحفظ کے اپنا سرِ تسلیم خم کرنے مقدور بھر کوشش کرتے ہیں، بعینہٖ جیسے پیغمبر ابراہیمؑ نے خود کو خدا کی حکمت کے سپرد کیا، جن کے عقیدے سے مسلمان خود کو بشوق منسلک کرتے ہیں... مزید برآں، وہ مُردوں کے دوبارہ زندہ کیے جانے کے بعد فیصلے کے دن اور خدا کی طرف سے جزا و سزا کا انتظار رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ایک صاف ستھری زندگی کو عزیز جانتے اور خدا کی عبادت کرتے ہیں، خاص طور پر 'نماز' کے ذریعے، نیز خیرات کے کاموں اور روزہ رکھنے کو [اہمیت دیتے ہیں]''۔ از Nostra Aetate، مقتبس در How to Understand Islam، از Jacques Jomier، (نیویارک، 1991ء)، ترجمہ کردہ از John Bowden، از فرانسیسی Pour Connaitre I'Islam، (پیرس، 1988ء)، صفحہ 132۔ تاہم، یہ بات قابلِ ملاحظہ ہے کہ اعلامیہ، پیغمبر محمدؐ کی رسالت کے سلسلے میں خاموش تھا۔ مسلمان پرامید ہیں کہ ان کی اعتقادی شہادت کے مکمل و کامل اعتراف کا یہ آخری قدم بھی اس کے بعد اٹھایا جائے گا۔

(۲۷) از Nostra Aetate، محولہ سابق، صفحہ 133۔

(۲۸) ''اگرچہ صدیوں کے گزر میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان بہت سی لڑائیاں اور عداوتیں ابھریں، [تاہم] یہ مقدس ترین مجلسِ کنائس سب سے مطالبہ کرتی ہے کہ ماضی کو بھلا دیں اور مخلصانہ طور پر باہمی فہم و افہام کے لیے مقدور بھر کوشش کریں۔ ساری انسانیت کی نمائندگی کرتے ہوئے انھیں سماجی انصاف، اخلاقی اقدار، امن، اور آزادی کے تحفظ اور نشو و نما کے مشترکہ مقصد کو حاصل کرنے دیا جائے،'' مقتبس از Nostra Aetate از Byron L Haines، در Perspectives of American Churches on Islam and the Muslim Community in North America: An Analysis of Some Official and Unofficial Statements، شائع شدہ در Muslims of America، مرتبہ: Yvonne Yazbeck Haddad، (نیویارک، 1991ء)، صفحہ 41-42۔

(۲۹) بین المذاہب بحث مباحثے، مناظرے اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مکالمے پر دستیاب مواد نہایت وسعت کا حامل ہے۔ ذیل کے خوب انتخاب کردہ حوالہ جات ان مسائل و مباحث کے پھیلاؤ کو ظاہر کرتے

ہیں جو مسلم مسیحی تعلقات میں پیدا ہوئے، اور تا حال پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ محض ان مشکلات ہی کو نمایاں کرنے کے لیے مفید نہیں جنھوں نے ان دو مذاہب کے پیروکاروں کے مابین تعلقات کو خراب کیا، بلکہ ان تحدیات و مواقع کی نشان دہی کرنے کے سلسلے میں بھی اتنے ہی فائدہ مند ہیں جو ہر دو اطراف کے نیک خواہشات رکھنے والے لوگوں کو درپیش ہیں۔

جدید دور میں پہلی مسلم مسیحی بات چیت دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر مسلم ممالک کی اکثریت کے استعماری اقتدار کے پنجے سے نجات حاصل کرنے اور اپنے قدیم شکوہ کی ظاہری شکل واپس حاصل کرنے کے بعد ہی عمل میں آئی۔ اس بات کا دستاویزی اندراج The Proceedings of the First Muslim-Christian Convocation، (منعقدہ Bhamdoun، لبنان، در [سال] 1954ء)، میں موجود ہے۔ بین المذاہب مکالمے کے بارے میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے لیے دیکھیے: '**أولويات الحركة الإسلامية في المرحلة القادمة**'، از یوسف القرضاوی، (قاہرہ، 1992ء؛ اشاعتِ اول، 1990ء)، صفحہ 172-183۔ اسماعیل راجی الفاروقی کی مرتبہ کتاب Trialogue of the Abrahamic Faiths، 1986ء میں نیویارک میں منعقد ہونے والی ایک بے سابقہ و نظیر 'مسلم یہودی مسیحی' بین المذاہب کانفرنس کی کارروائی کا احاطہ کرتی ہے۔ اسماعیل فاروقی، جدید دور میں تقابلِ ادیان میں کسی بھی مسلمان کے حاصل کردہ مضبوط ترین تعلیمی پسِ منظر کا حامل اسکالر تھا۔ وہ 1986ء میں اپنی وفات تک بین المذاہب مکالمے کے سلسلے میں مسلم معاشرے کا سب سے اہم سرگرم کارکن رہا۔ ایک مغربی اسکالر کی فاروقی کے بارے میں اندازہ جاتی رائے کے لیے دیکھیے: Ismail R al-Fauqi: Muslim Scholar-Activist، از John L Esposito، [شائع شدہ] در The Muslims of America، مرتبہ: Yvonne Yazbeck Haddad، (نیویارک، 1991ء)، صفحہ 65-79۔ خورشید احمد اور اسماعیل راجی الفاروقی دونوں نے Christian Mission and Islamic Da'wah: Proceedings of the Chambesy Dialogue Consultation، (Leicester، برطانیہ، 1982ء، اصلاً شائع شدہ در International Review of Missions, 65، اکتوبر، 1976ء)، میں اس موضوع پر توجہ مرکوز کی ہے۔ یہ روداد اس مسلم مسیحی مکالمے کو محفوظ کرتی ہے جو 1976ء میں Switzerland میں عمل میں آیا، اور جس نے متعلقہ مسلمان نمائندگان کی درخواست پر مسلمانوں کے معاشروں میں ہونے والی عیسائی مشنری سرگرمی کے زیرِ بحث لانے کو اولیت دی۔ محولہ بالا کتاب Trialogue of the Abrahamic Faiths، میں شائع شدہ محمد عبد الرؤف کا مقالہ Judaism and Christianity in the Perspective of Islam، (صفحہ 22-28)، اسلام اور دیگر 'وحدانیت' کے علم بردار دو مذاہب کے درمیان عقائدی نوعیت کے اتفاق و اختلاف کی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے پوری پوری وضاحت کا حامل ہے۔ مسلم مسیحی مکالمے کے سلسلے میں ایک ذاتی تجربہ ایک سوڈانی یونیورسٹی پروفیسر Al-Tayib Z Al-Abdin کا بیان کردہ ہے، جس نے اپنی اہم تعلیمی و تحقیقی رخصت کا ایک سال Birmingham (برطانیہ) میں Selly Oak Colleges کے Centre for the Study of Islam and Christian-Muslim Relations، میں صَرف کیا۔ اس نے How did I Find Selly Oak?- A Word of Encouragement، شائع شدہ در Newsletter، (یکے از منشوراتِ مرکز)، No. 17/18، مئی/نومبر 1987ء، صفحہ 4-6، میں اپنے اور مذکورہ مرکز کے عیسائی اسٹاف کے بین المذاہب مکالمے اور مسلمانوں کے بارے میں ردِعمل، نیز مختلف اپنائے ہوئے رویوں کی ایک منہ بولتی حقیقی سرگزشت بیان کی ہے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں ہر دو کے ''رگ و ریشہ میں پیوست موروثی نوعیت

کے تعصّبات'' کو ختم کرنے میں ذاتی روابط کی اہمیت کو اسکاٹ لینڈ کے آنجہانی پروٹسٹنٹ پادری اور 'اسلامیات' کے اسکالر W Montgomery Watt نے بھی Thoughts on Muslim-Christian Dialogue، شائع شدہ در The Muslim World, 57، (1967ء)، صفحہ 19-23، میں بیان کیا ہے۔ نیز دیکھیے: اسی مصنف کی کتاب Christian-Muslim Encounters، (نیویارک، 1991ء)؛ Charles A Kimball کی کتاب Striving Together: A Way Forward in Christian-Muslim Relations، (نیویارک، 1991ء)، ایک اور تصنیفی کام ہے جو اس موضوع پر عیسائی نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے۔ 'وحدانیت' کے علم بردار ان تین مذاہب کی ایک 'سہ فریقی کانفرنس'(trialogue) مارچ 1985ء میں California میں Los Angeles کے نزدیک، Claremont Graduate School میں منعقد ہوئی۔ Three Faiths, One God: A Jewish, Christian, Muslim Encounter، (نیویارک، 1989ء)، اس کانفرنس میں ان تینوں مذاہب کے نمائندگان کے پیش کردہ قیمتی مقالات کو یکجا صورت میں پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کو John Hick اور Edmund S Meltzer نے ایک افسوس ناک سیاسی تعصب کے ساتھ مرتب کیا ہے، اور یہ اس بات کی ایک بہترین مثال کا کام دے سکتی ہے کہ ہم آہنگی کے لیے بروئے کار آنے والے اس مکالمے پر کیونکر ایک ایسی کتاب مرتب نہیں کی جا سکتی جس کا پہلا اور بنیادی مقصد باہم مذہبی فہم و افہام ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عیسائیوں کے برعکس (جو بین المذاہب مکالمے کے لیے بیشتر اپنے رسمی ترجمانوں کو مختلف کنیسہ جات کی نمائندگی کے لیے مقرر کرتے ہیں) مسلمان شرکت کار کسی 'مذہبی پیشوائی کے سلسلۂ مناصب' سے تعلق نہیں رکھتے اور یوں خود اپنے ذاتی نظریات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے ساتھ بین المذاہب مکالمے پر سرکاری رومن کیتھولک نقطۂ نظر کے لیے دیکھیے: Guidelines for Dialogue between Christians and Muslims، شائع کردہ از Pontifical Council for Interreligious Dialogue، (Mahawa, N J، 1990ء)؛ نیا ایڈیشن تیارکردہ از Maurice Borrmans، اور ترجمہ کردہ از R Marston Speight، از فرانسیسی ایڈیشن Orientations pour un Dialogue antre Chrestiens et Musulmans، (پیرس، 1981ء)۔ Guidelines میں 'رومن کیتھولک چرچ' پیغمبرِ اسلام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، صفحہ 57-58۔ Guidelines میں ایک مفید ضمیمہ بعنوان: Organized Occaisions for Muslim-Christian Dialogue in the Last Twenty Years بھی شامل ہے، جو 1969ء سے لے کر 1988ء تک مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ہونے والے تمام مکالمہ جات کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ اس موضوع پر 'پروٹسٹنٹ چرچ' کے نقطۂ نظر کے لیے Christians and Muslims Together: An Exploration by Presbytrians، مرتبہ: Byron L Haines اور Frank L Cooley، (Philadelphia، Pennsylvania، 1987ء)، ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ نیز اس پر مذکورہ کتاب کے ایک مرتب Byron L Haines کے ایک مختصر جائزے کا اضافہ کیا جا سکتا ہے، جو امریکا کے تمام تر، بشمول انجیلیاتی بنیاد پرستوں کے کنیسہ جات کے بارے میں ہے، اس کا عنوان ہے: Perspectives of American Churches on Islam and the Muslim Community in North America: An Analysis of Some Official and Unofficial Statements، شائع شدہ در The Muslims of America، مرتبہ: Yvonne Yazbeck Haddad، (نیویارک، 1991ء)، صفحہ

52-39۔ ایک معروف برطانوی پادری نے مسلمانوں کے ساتھ گفت و شنید پر اپنا نقطۂ نظر اس کتاب میں پیش کیا ہے: The Call of The Minaret، از Kenneth Cragg، (دوسرا نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن، نیویارک، 1985ء؛ اشاعتِ اول، 1956ء)۔

جیسے کہ واضح ہو گا کہ مستشرقین کے بارے میں یا ان کی تصنیف کردہ کتابیں، محولہ در حاشیہ نمبر 22 اور 23، جیسے Norman Daniel کی Islam and the West: the Making of An Image، (نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن، آکسفورڈ، 1993ء؛ پہلا ایڈیشن، Edinburgh، 1960ء)، بھی اس مکالمے اور اس سلسلے میں معلومات کے متعلق ایک خاص اندازِ نظر کی حامل ہیں جو مسلم مسیحی تعلقات سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہاں اس شعبے سے صرف فوری مناسبت رکھنے والی کتب و مقالات کا ذکر کیا جائے گا۔ Polemique, apologie et dialogue islamo-chrestiens: positions classiques medievales et positions contemporaines، شائع شدہ در Euntes Docete 22، (1969ء)، صفحہ 376-451، میں ایک مصری Dominican پادری Georges C Anawati (Qanawati) نے نویں صدی سے لے کر بیسویں صدی عیسوی تک مسلمانوں کے مناظرہ جاتی کام کے مواد اور ارتقا کی عیسائی نقطۂ نظر سے تاریخ بیان کی ہے۔ Richard Lemay نے اسی طرح کا، مگر کم پھیلاؤ کا حامل کام اپنے ذمے لیا اور L'apologetique contre l'Islam chez Pierre le Venerable et Dante، شائع شدہ در Melanges Offerts a Rene Crozet، مرتبہ: Pierre Gallais و Yves-Jean Riou، (Poitiers، 1966ء)، جلد II، صفحہ 755-764، میں عیسائی فریق کے مناظرہ جات کی تاریخ کو پیش کیا ہے۔ 'قرونِ وسطیٰ' کے دوران بروئے کار آنے والی مسلم مسیحی بات چیت پر Peter the Venerable کے بدستور برقرار ورثے کا ایک مفصل جائزہ J Kritzeck کی تصنیف Peter the Venerable and Islam، (Princeton، 1964ء)، میں ملتا ہے۔

مکالمے میں شامل تمام مذاہب کے پیروکاروں کو درپیش مشکل مسائل اور فریب دہ مواقع، نیک خواہشات رکھنے والے علمائے الٰہیات، مؤرخین، مفکرین، بلکہ غیر متخصص اصحابِ نقد و نظر کی فزوں تر توجہ اپنی طرف مبذول کر رہے ہیں۔ بین المذاہب ہم آہنگی کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ہونے والی تازہ علمی کوششوں میں M Darrol Bryant کا مقالہ Overcoming History: On the Possibilities of Muslim-Christian Dialogue، شائع شدہ در World Faith Encounters، (آکسفورڈ)، شمارہ نمبر 15، (نومبر 1996ء)، صفحہ 3-13، بھی شامل ہے، جو ریاست ہائے متحدۂ امریکا اور کینیڈا میں مسلم مسیحی مکالمے کا 'خاص حوالہ' لیے ہوئے ہے۔ عطاء اللہ صدیقی نے کثرت سے بین المذاہب مکالمے کے بارے میں اپنے گہرے ذاتی علم پر مبنی افادی دلچسپی کے ساتھ اس موضوع پر لکھا ہے۔ اس کی تحریروں میں ذیل کی کتب و مقالات شامل ہیں: Christian-Muslim Dialogue in the Twentieth Century، (لندن، 1997ء)، جو ایک تفصیلی مطالعہ ہے؛ Muslims and Inter-Faith Dialogue in Britian: An Overview، شائع شدہ در World Faiths Encounters، (آکسفورڈ)، شمارہ نمبر 15، نومبر 1996ء، صفحہ 14-19؛ Christian-Muslim Dialogue: Problems and Challenges، شائع شدہ در Encounters، (Leicester، برطانیہ)، 2:2، (1996ء)، صفحہ 123-136؛ یہ دونوں مقالے کامیاب مکالمے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے والے مسائل کا جائزہ لیتے ہیں۔ Cristian-Muslim Frontier: Chaos, Clash or Dialogue?، مرتبہ: Jorgen S Nielsen، (لندن، 1998ء)،

مسلم مسیحی مکالمے سے گہرے طور پر وابستگی رکھنے والے ایک عیسائی کی تصنیف ہے۔
مسلم مسیحی مکالمے کے تاریخی اور فلسفیانہ پسِ منظر کے لیے دیکھیے: Islam and the Encounter of Religions، از Seyyed Hossein Nasr، شائع شدہ در The Islamic Quarterly, 10، (1996ء)، صفحہ 47-68؛ Identification of Problem: The Irenic Potential of Religions، از Huston Smith، مرتبہ: Edward J Jurji، شائع شدہ در Religious Pluralism and World Community: Interfaith and Intercultural Communication، (لیڈن، 1969ء)، صفحہ 21-31؛ World Religions as Seen in the Light of Islam، از Jacques Waardenburg، شائع شدہ در Islam: Past Influence and Present Challenge. In Honour of William Montgomery Watt، (Edinburgh، 1979ء)، صفحہ 245-275، مع ایک عمدہ کتابیات؛ Is Cultural and Religious Co-existance Possible? How Can We Deal with Our Points of Agreement and Disagreement? Harmony and the Right to be Different، از Mohamed Talbi، شائع شدہ در Encounters، (Leicester، برطانیہ)، 1:2، (1995ء)، صفحہ 74-84، ترجمہ کردہ از فرانسیسی از Michael Walpole۔ Talbi، دیگر معاملات کے ساتھ مغرب میں تارکِ وطن مسلمانوں کی صورتِ حال اور مسلمانوں میں مذہبی آزادی کا سوال بھی زیرِ بحث لاتا ہے۔

(۷۰) Selly Oak Colleges کے مرکز کے ایک سابق سربراہ، David Kerr کا کہنا ہے: ''مرکز عیسائیوں کو اپنی عیسائی روایت سے وفادار رہتے ہوئے اسلام کے زیادہ ہمدردانہ فہم کے سلسلے میں مدد دینے کے کا بھی پختہ عہد رکھتا ہے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے مکالمے کی تازہ نشستوں میں پیغمبر محمدؐ کی زندگی اور مذہبی حیثیت کی عیسائی تشریح کا مسئلہ بکثرت سامنے آیا''، نیز ''...عیسائیوں کے لیے 'خود مسلمانوں کے اپنے عقیدے کے اندازِ اظہار' پر گہری توجہ دینے کی ضرورت اس مرکز میں انجام پانے والے سارے کام کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہے، اور شکرِ ایزد کہ یہ ضرورت مرکز قیام سے لے کر اب تک کے تمام مرحلوں میں مسلمانوں کی معیاری شرکت سے پوری ہوئی ہے''۔ مرکز کے Newsletter کا اداریہ، از David Kerr، شمارہ نمبر 18/17، مئی/ نومبر 1987ء، صفحہ 2 ؛ 3۔

(۷۱) How did I Find Selly Oak? A Word of Encouragement، از Al-Tayib Z Al-Abdin، شائع شدہ در Newsletter، شمارہ نمبر 18/17، مئی/ نومبر 1987ء، صفحہ 5: ''یہ میرے لیے حیرانی کی بات تھی کہ Selly Oak Colleges کے Islam Centre کو میں نے سیکولر یونیورسٹیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے لیے زیادہ برداشت کا حامل اور نرم خو پایا۔ یہ مرکز اسلام کو خدا کے سچے اعتقاد کے طور پر، نیز مسلم مسیحی مکالمے کو، جو فہم و افہام اور پرامن بقائے باہمی کے عمل کو آگے بڑھاتا ہے، پیش کرنے کے سلسلے میں پختہ عہد کا حامل ہے۔ اسی میں مرکز کی اصل خوبی مضمر ہے''۔

(۷۲) 1996 Annual Report، Pfizer Inc.، (نیویارک، 1997ء)، صفحہ 6۔

(۷۳) Nightly Business Report، [PBS]، 14/ مئی، 1997ء، ٹی وی نشریہ۔

(۷۴) مغربی روایتی بنکوں کے اسلامی اقتصادیاتی اداروں کے ساتھ اشتراک میں نئی پیش رفت کے لیے دیکھیے: Globalization and Islam: Cross-Cultural Business Ventures، از Rodney

Wilson، غیر شائع شدہ مقالہ جو 26/ستمبر 1996ء کو Goergetown University، واشنگٹن ڈی سی، میں منعقدہ First Annual Gulf Economic Conference: Gulf Economies in the 21st Century میں پیش کیا گیا۔

(۷۵) ریاست ہائے متحدہٴ امریکا میں اخلاقی اور سماجی لحاظ سے ذمہ دارانہ سرمایہ کاری (investment) کے بارے میں دیکھیے: ?Want to Put Your Money Where Your Conscience Is، از Dee Gill، شائع شدہ در Business Week، (امریکی ایڈیشن)، 8/ستمبر1997ء، صفحہ 134-135۔ Gill کا کہنا ہے (صفحہ 134): ''[ایسے] بہت سے لوگوں کا سامنا کرنے پر جو منافع کے بعد اپنا اضافی زر [کہیں] لگانے پر اصرار کرتے ہیں، مالی معاملات چلانے والوں نے [اس طرح کے] فنڈ قائم کیے ہیں جو معینہ اخلاقی، 'معنوی' اور مذہبی مسائل پر توجہ دیتے ہیں''۔ یہاں مقالہ نگار ایک فنڈ چلانے والے کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے کہ: ''ہم واقعی یہ خیال کرتے ہیں کہ یہاں ہمارے سرمایہ کاری کے اور سماجی مسائل باہم اکٹھے ہو رہے ہیں''۔

(۷٦) قرآن، الحجرات: 13، ﴿يأيها الناس، إنا خلقنكم من ذكر وأنثى وجعلنكم شعوبا وقبائل لتعارفوا، إن أكرمكم عند الله أتقاكم....﴾

(۷۷) قرآن، المائدہ: 48، ﴿....ولو شاء الله لجعلكم أمة واحدة....﴾

(۷۸) قرآن، العصر: 2-3، ﴿والعصر، إن الإنسان لفي خسر، إلا الذين آمنوا وعملوا الصٰلحٰت، وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر﴾

☆☆☆☆☆